مقالاتِ سیرت
سنجیدہ اور شگفتہ انداز میں
سیرتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے
مختلف پہلوؤں کا خلاصہ اور عطر
ڈاکٹر آصف قدوائی
(ایم اے، پی ایچ ڈی)
مقدمہ
مولانا سیّد ابو
مجلس نشریات اسلام
مجلد

سلسلۂ مطبوعات

۲۲
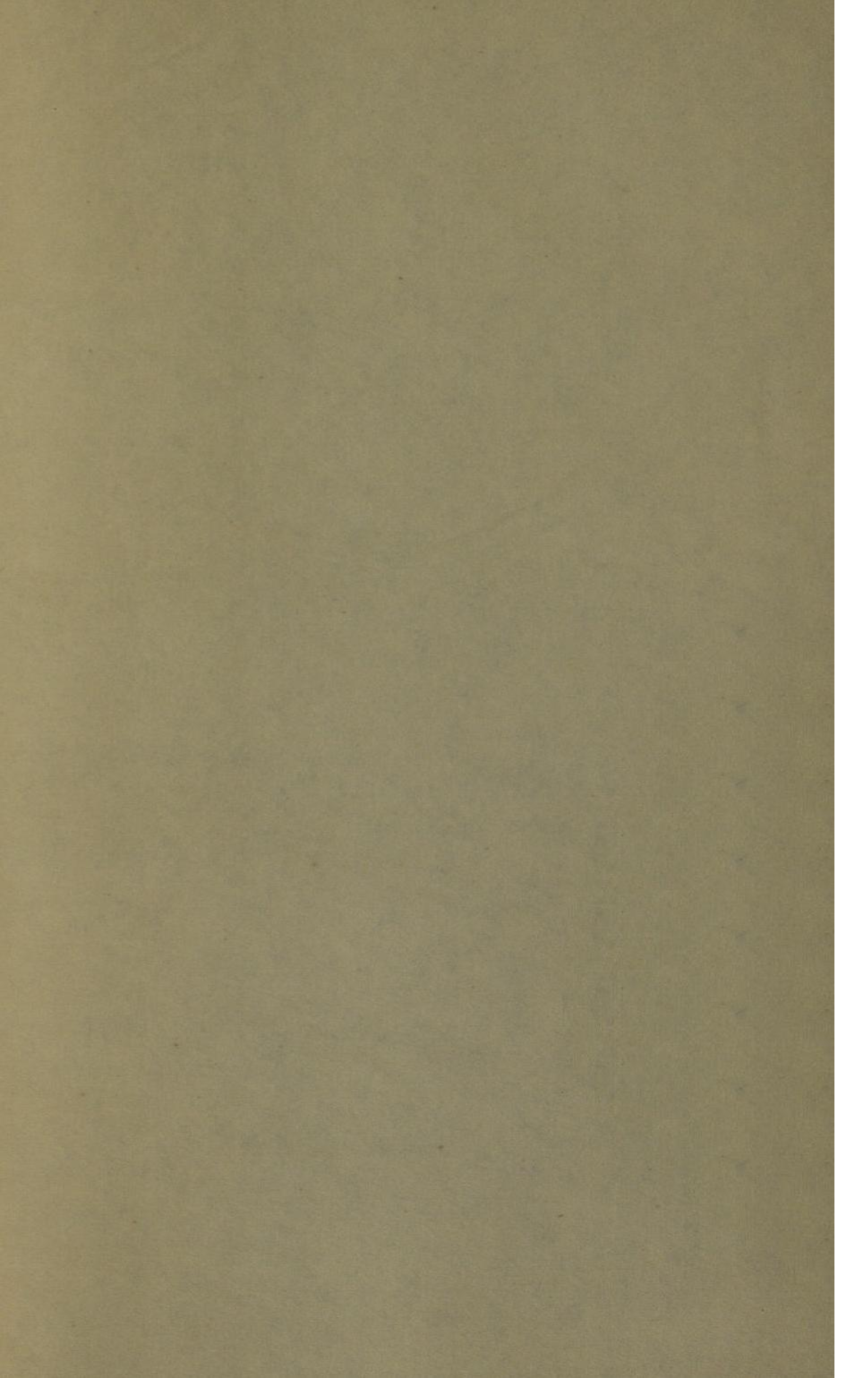
مقالاتِ سیرت

مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی کے مقدمہ کے ساتھ

مصنّفہ

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی

ناشر

فضلِ ربّی ندوی

مجلسِ نشریاتِ اسلام ۱/کے-۳- ناظم آباد مینشن نزد برف خانہ ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸
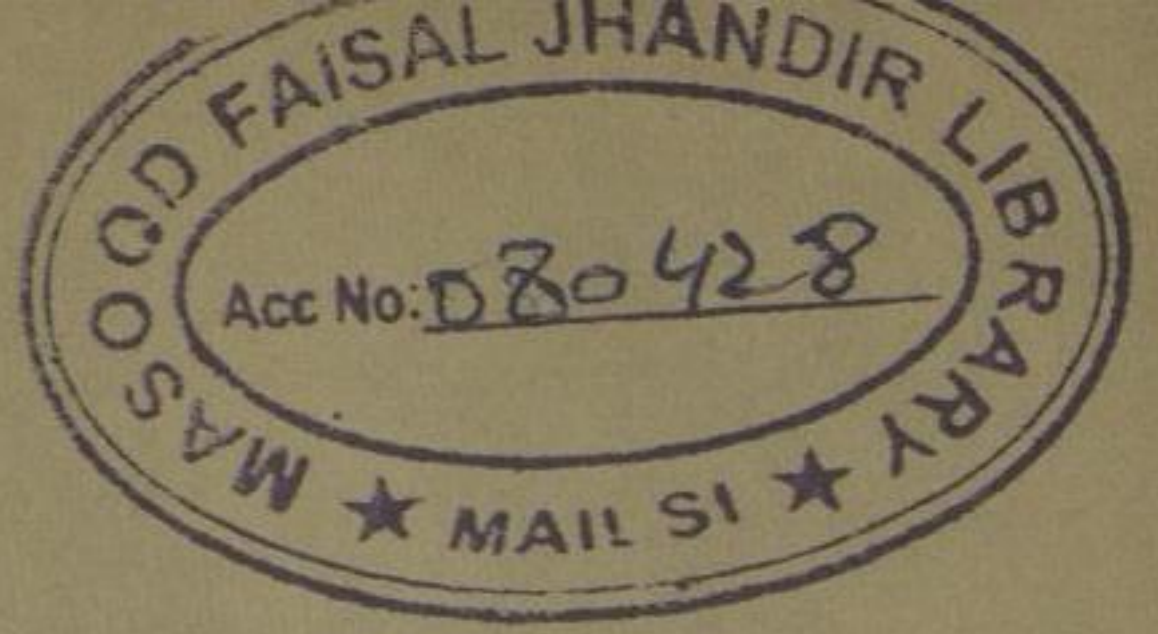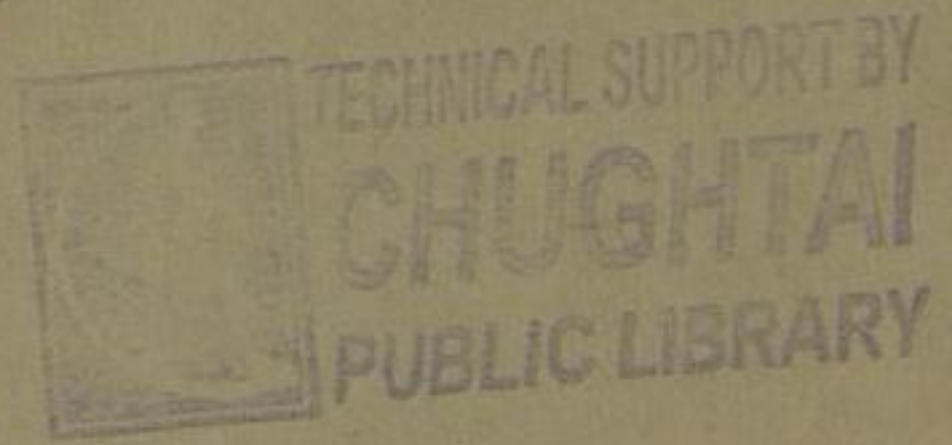
نام کتاب .. .. مقالات سیرت

مصنف .. .. ڈاکٹر محمد آصف قدوائی ایم اے پی ایچ ڈی

سال اشاعت ۱۹۷۷ء

تعداد .. .. بارہ سو

کتابت .. .. انوار ہاشمی

مطبوعہ .. .. تنویر پروسس

قیمت مجلد مع گرد پوش .. .. -/۱۸ روپے

ناشر
فضلِ ربی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱/کے-۳-ناظم آباد مینشن ناظم آباد کراچی

فہرست

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا اِنْ نَّسِيْنَا اَوْ اَخْطَاْنَا

(خدایا اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو دارو گیر نہ فرما۔)

محمد آصف قدوائی

کچہری روڈ۔ لکھنؤ

۱۴ر جولائی سنہ ۱۹۵۹ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تعارف و پیش لفظ

از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

اَلحَمدُ لِلّٰہِ وَکَفٰی وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِینَ اصطَفٰی

نوع انسانی کے پاس خالق کائنات کے عطیوں اور صنعتوں میں سے سب سے زیادہ حسین، سب سے زیادہ باوقار، سب سے زیادہ طاقتور، سب سے زیادہ پرفیض عطیہ اور شاہکار ان پیغمبروں کی سیرت اور ان کا اصلاحی کارنامہ ہے جن کو وہ وقتاً فوقتاً مختلف ملکوں میں پیدا کرتا رہا ہے۔ انسانیت کی عزت و آبرو انہی کے سیرتوں سے قائم ہے، اگر انسانیت کے مرقع سے ان کو علیٰحدہ کر دیا جائے تو دنیا کی تاریخ نائے و نوش، ہوا و ہوس، خود غرضی و خود مطلبی، جنگ و جدال، اوہام و خرافات، اور جہالت و ضلالت کی داستان بن کر رہ جاتی ہے۔ جس میں کہیں کہیں رشد و ہدایت کے دیئے ٹمٹماتے نظر آتے ہیں۔ ان کے متعلق بھی تحقیق کی جاتی ہے تو ان کی روشنی کی تاریخ بھی کسی پیغمبر برحق کی تبلیغ و ہدایت اور جدو جہد سے وابستہ نظر آتی ہے۔ ان چراغوں کی حقیقت بھی گمراہی اور جہالت کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں اس سے زیادہ نظر نہیں آتی کہ برسات کی اندھیری رات میں

کچھ جگنو اڑتے اور چمکتے نظر آتے ہیں، ایسی ہدایت اور رہنمائی جس سے انسانیت کے بھٹکے ہوئے قافلے منزل کی راہ پائیں اور تہذیب و تمدن کے ڈوبتے ہوئے سفینے کنارے لگ جائیں، صرف پیغمبروں ہی کے یہاں نظر آتی ہے۔

آج بھی دنیا میں جو اخلاقی حقیقتیں زندہ موجود ہیں، انسانوں کے پاس بدی سے لڑنے، نفس پر قابو پانے اور گناہ سے بچنے کی جو اندرونی طاقت نیک و بد، ظلم و عدل اور حق و باطل میں امتیاز کرنے کا جو ملکہ اور انسانوں کی بے لوث خدمت کرنے کا جو جذبہ پایا جاتا ہے وہ انہی پیغمبروں کی قربانی و جدوجہد کا نتیجہ ہے جنھوں نے ناموافق ترین حالات میں خدا کے احکام کو پہنچایا اور بارہا انسانیت اور انسانی تہذیب و تمدن کو ہمیشہ کی تباہی اور ہلاکت سے بچایا اور انسانیت کو نئی زندگی بخشی، حیوانیت پر انسانیت کی دوبارہ فتح کے لئے ان کی تعلیمات سے بہتر تعلیمات اور ان کی نظیر سے زیادہ شاندار نظیر نہیں مل سکتی۔ آج جبکہ انسانیت کو پھر یہ معرکہ درپیش ہے اس سے زیادہ کوئی مفید کام نہیں کہ ان کی سیرت اور تعلیمات کو دوبارہ دنیا کے سامنے پیش کیا جائے اور اس پر خود چلنے کی کوشش اور دوسروں کو چلانے کی جدوجہد کی جائے۔

ان پیغمبروں میں (اللہ تعالیٰ کا درود و سلام ہو ان پر) کامیابی سب سے زیادہ جس کے نصیب میں آئی اور جغرافیائی و تاریخی وسعت کے لحاظ سے انسانیت اور تہذیب و تمدن کے سب سے بڑے رقبے کی رہنمائی جس کے سپرد فرمائی گئی وہ بلاشبہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ گروہ انبیاء میں سے صرف آپ ہی کی سیرت اور زندگی اس وقت محفوظ اور دنیا کی رہنمائی اور دستگیری کے لئے ہر جگہ موجود ہے۔ یہ انسانیت کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اس میں پیغمبروں کی سیرتوں کا عطر، آسمانی تعلیمات و ہدایت کا جوہر اور اخلاق و

روحانی طاقت کا سب سے بڑا خزانہ پوشیدہ ہے۔ اس کو پڑھ کر خدا کی ہستی اور اس کی مدد کا یقین پیدا ہوتا ہے۔ ناموافق ترین ماحول اور حالات میں بدی اور ظلم کا مقابلہ کرنے کا حوصلہ ابھرتا ہے اور انسانیت کو اپنے وجود پر بجائے شرم کے فخر محسوس ہوتا ہے اور اگر مذہبی تعصب اور قومی تکبر آڑے نہ آئے تو ساری دنیا اس سے نئی زندگی، نیا یقین، نئی روحانی لذت، نیا عزم و حوصلہ اور از سر نو نجات کا راستہ حاصل کر سکتی ہے۔ اس لئے اس کی اشاعت سے زیادہ کوئی مفید کام نہیں۔

سیرت محمدی کے موضوع پر دنیا کی مختلف زبانوں میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس کا شمار کرنا مشکل ہے۔ سیرت کا شاید ہی کوئی ایسا پہلو ہو جس پر روشنی نہ ڈالی گئی ہو، اردو زبان اس باب میں امتیاز خاص رکھتی ہے کہ سیرت کی بعض مستند وسیع ترین اور موثر ترین کتابیں اس میں لکھی گئیں اور دوسری اسلامی زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔

زبان و ادب اور خود انسانی ذہن تغیر پذیر ہے، تمدنی و سیاسی انقلابات و تغیرات نئے نئے مسائل و سوالات پیدا کرتے رہتے ہیں۔ کچھ مدت پیشتر جن سوالات و مسائل کی بڑی اہمیت تھی اور سیرت نگاروں نے ان کو اپنی توجہ کا مرکز بنایا، آج ان میں وہ اہمیت و جاذبیت نہیں ہے، اور دنیا کا ذہن ان کے جواب و تشریح کا مطالبہ نہیں کرتا۔ آج کچھ نئے مسائل و سوالات پیدا ہو گئے ہیں جن کی طرف توجہ کرنا اور یہ دکھانا کہ سیرت محمدی اس باب میں کیا رہنمائی کرتی ہے سیرت نگار کے لئے ضروری ہے، پھر یہ زمانہ سرعت و عجلت کا ہے، سیرت کی ضخیم کتابوں کا پڑھنا اس زمانے کے مصروف و تیز رو انسان کے لئے دشوار ہو گیا ہے، ان تمام حالات کا تقاضا تھا کہ سیرت پر ایک مفصل و ضخیم تصنیف کے بجائے تعلیمیافتہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے لئے سیرت کے مختلف پہلوؤں پر سنجیدہ

شگفتہ انداز میں لکھا جائے اور سیرتِ محمدی کا خلاصہ وعطر پیش کر دیا جائے اور دنیا کو یہ بتایا جائے کہ بیسویں صدی کی دنیا کے لئے اس کے پاس کیا پیغام ہے اور انسانی زندگی کی تشکیل اور سیرت و کردار کی تعمیر میں کیا محل و مقام ہے، اس اہم کام کے لئے ایک ایسے صاحبِ علم کی ضرورت تھی جو سیرت کے مطبوعہ ذخیرہ کا صبر و ہمت سے جائزہ لے جس کا عقیدت مند دل اور ہوش مند دماغ اس کے انتخاب و تلخیص میں پورا تعاون کریں، وہ نئے ذہن، نئے طرزِ فکر اور نئے طرزِ تحریر سے پورے طور پر واقف ہو، وہ اپنے مطالعہ و فکر کا نتیجہ ایسے مضامین کی شکل میں پیش کر دے جن میں علم کی سنجیدگی، ادب کی شگفتگی، مطالعہ کی وسعت، دلائل کا وزن، محبت کی چاشنی پہلو بہ پہلو ہوں کہ جس حیاتِ طیبہ اور اُسوۂ کاملہ سے ان کو نسبت ہے ان سے دل و دماغ دونوں اپنی مراد پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اس کام کے لئے ڈاکٹر محمد آصف کا انتخاب فرمایا، ڈاکٹر محمد آصف کا تعلق بارہ بنکی کے اس نامور قدوائی خاندان سے ہے جو اپنی دماغی و عملی صلاحیتوں کے لئے صرف اَوَدھ ہی میں نہیں سارے ہندوستان میں مشہور رہے۔ ان کی پرورش بھیارہ (ضلع بارہ بنکی) کے ایک زمیندار خاندان میں ہوئی جو دنیاوی وجاہت و ثروت کے ساتھ علم و ادب کا بھی ذوق رکھتا تھا اور اپنی وضعداری اور خاندانی روایات کی بنا پر اپنے جوار میں خاص وقار و امتیاز کا مالک ہے۔ محمد آصف صاحب ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے ۱۹۴۲ء میں ۲۳ سال کی عمر میں ایم۔ اے کیا، پھر ۱۹۴۷ء میں سیاست میں پی، ایچ، ڈی کی ڈگری لی۔ ان کا ڈاکٹریٹ کا مقالہ لندن کے مشہور فاضل و محقق پروفیسر لاسکی کو جانچنے کے لئے بھیجا گیا، انھوں نے پرزور الفاظ میں اس کی تعریف اور صاحبِ مقالہ کے لئے ڈاکٹریٹ کی سفارش کی۔

اگر حالات اپنی طبعی رفتار سے چلتے رہتے تو معلوم نہیں ہمارے عزیز فاضل دوست محمد آصف صاحب آج کس علمی اعزاز اور مادی امتیاز پر فائز ہوتے اور ان کا کیا مشغلہ ہوتا، لیکن قدرت کے کاروبار عجیب ہیں اور خدا کی حکمت کو کوئی نہیں جانتا، ان کے لئے ایسے حالات پیدا کئے گئے کہ وہ دنیا کے تمام کاموں سے یکسو ہو کر علم و مطالعہ اور اس راہ سے خدمتِ دین کے لئے وقف ہو جائیں۔ جس مربی حکیم نے امام ابن تیمیہ کو دمشق کے قلعہ میں بٹھا کر انقطاع عن الخلق کی دولت اور اہم تصانیف کی توفیق عطا فرمائی اور جس نے اس دورِ آخر میں بیسویں صدی کے مردِ مومن محمد علیؒ کو چھندواڑہ کے حدود میں مقید کر کے قرآن مجید کے حفظ و فہم کی دولت جاوید عطا فرمائی وہ اگر کسی بندہ کو کسی جگہ بٹھا کر یا آرام سے لٹا کر اور تمام دنیا کے مقاصد و مشاغل سے یکسو بنا کر اپنے دین کی خدمت لیتا ہے اور اپنے رسول پاک کی سیرت نگاری کی توفیق دیتا ہے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

محمد آصف صاحب کا مطالعہ بہت وسیع ہے، اردو اور انگریزی دونوں میں ان کا مطالعہ تازہ اور UP TO DATE ہے، ادب، تاریخ اور سیاست ان کا خاص موضوع ہے اور اب دینیات و تصوف سے بھی ذوق اور ان کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو گیا ہے، انگریزی کے صاحب طرز انشاپردازوں کی نثر کا انھوں نے وسیع اور گہرا مطالعہ کیا ہے، انگریزی نثر و انشاء کے مطالعہ نے ان کی اردو تحریر میں انگریزی انشاپردازی اور نثر جدید کی خصوصیات پیدا کر دی ہیں، اپنے موضوع کی پابندی، حشو و زوائد سے احتراز، اختصار کے ساتھ قوت و تاثیر ان کی تحریر کا جوہر ہے، ان کا سارا نشو و نما لکھنؤ میں ہوا ہے اور علم و ادب کی محفلوں اور ماحول میں ان کی عمر گزری ہے، وہ شروع سے اردو میں لکھتے رہے اسلئے

ان کے قلم میں پختگی اور شگفتگی دونوں موجود ہیں۔

محمد آصف صاحب نے جب اس کام کا بیڑا اٹھایا تو اردو اور انگریزی کے سارے ذخیرے کو جو سیرت کے متعلق تھا، کھنگالا۔ انھوں نے جس طرح اردو میں سیرت کی مستند اور ضخیم کتابیں پڑھیں، اسی طرح سیرت پر انگریزی مصنفین نے موافقانہ و مخالفانہ جو کچھ لکھا ہے اس کا بھی جائزہ لیا۔ انھوں نے اپنی قلم کو صرف زندگی اور حیات طیبہ پر لکھنے کا پابند نہیں کیا، بلکہ ان تمام مسائل و حقائق کو پیش نظر رکھا جو ایک کامل زندگی اور کامل تعلیم کی رہنمائی کی طالب ہیں، ان کا موضوع سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی اور حیات طیبہ بھی ہے آپ کا پیغام اور آپ کی پیش کی ہوئی تعلیم بھی، وہ موقع بموقع یہ بھی دکھاتے چلتے ہیں کہ یہ تعلیم اس نئی نسل اور اس نئے دور کی کیا رہنمائی اور دستگری کرتی ہے اور نئی تہذیب اس سے بے نیاز ہو کر یا اس سے انکار کر کے کن کن مصائب میں مبتلا ہے۔ ان کے مضامین کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ماحول اور زمانہ سے غیر متعلق اور ناآشنا نہیں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا ان مضامین کو کسی الگ تھلگ مقام پر زندگی اور اس کے مسائل سے آنکھیں بند کر کے نہیں لکھ رہا ہے بلکہ اسی پر شور رواں دواں زندگی میں ہے اور خود بھی قلب حسّاس، دیدۂ بینا، گوش شنوا رکھتا ہے، وہ نئے واقعات اور تجربات سے فائدہ اٹھاتا ہے اور ان سے صحیح نتائج نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

بعض موضوع ایسے ہیں جن پر اس سے پیشتر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، ان میں بظاہر کوئی نئی بات کہنی مشکل ہے، مثلاً یہ بات کہ "اسلام بزور شمشیر پھیلا" اس پر سر سید احمد خاں اور مولانا شبلی کے وقت سے ہمارے اس دور تک بہت کچھ اور بہت خوب لکھا جا چکا ہے، پھر بھی آصف صاحب نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ پڑھنے کے قابل ہے اور

اس موضوع پر ایک اضافہ ہے۔ اسی طرح "دورِ جاہلیت" سیرت کی ہر کتاب کا ایک لازمی باب اور ضروری مضمون ہے لیکن آصف صاحب نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے وہ پرمغز اور پراز معلومات ہے، چونکہ انگریزی ماخذوں پر اور عہد جاہلی کی معاصر تاریخوں پر ان کی اچھی نظر ہے، اس لئے اس سلسلہ میں انھوں نے قیمتی اور منتخب مواد پیش کر دیا ہے۔ جس سے عہد جاہلیت کی تصویر سامنے آجاتی ہے۔

ساری کتاب شستہ و شگفتہ زبان میں لکھی گئی ہے۔ کہیں الجھاؤ، تصنّع اور لفاظی نہیں معلوم ہوتی، طرز بیان سادہ لیکن موثر ہے، بعض حصّے تو سادگی و سلاست کے باوجود اچھی خاصی ادبیت کے حامل ہیں۔ یہ مضامین اپنے مواد و معلومات، استدلال و مطالعہ، طرزِ تحریر و تاثیر اور لکھنے والے کے خلوص و حسن نیت، ہر اعتبار سے پڑھے جانے اور اشاعت پانے کے مستحق ہیں۔ اور ان کے ذریعہ سیرت محمدی کا خلاصہ اور اس کے اہم پہلو اور گوشے اور اس کا پیغام سامنے آجاتا ہے، اور دورِ جدید کے لئے اس سے بہتر کوئی تحفہ نہیں ہو سکتا۔

"مجلس تحقیقات و نشریات اسلام" جس کا مقصد ہی تعلیمیافتہ مسلمانوں اور غیر مسلم اصحاب کے لئے سنجیدہ و پرمغز، صالح و مؤثر، خیال افروز و یقین آفریں اسلامی لٹریچر کا تیار کرنا اور پہنچانا ہے، بڑی مسرت اور شکریہ کے ساتھ اس کتاب "مقالات سیرت" سے اپنی مطبوعات و سلسلۂ اشاعت کا آغاز کرتی ہے، امید ہے کہ وہ بہت جلد دوسرے مفید عنوانات و مضامین پر جن کا ہماری موجودہ زندگی اور اسکے مسائل سے گہرا تعلق ہے مفید اور وقیع کتابیں پیش کرے گی۔ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللہِ۔

ابوالحسن علی

لکھنؤ، ۱۰ محرم الحرام ۱۳۷۹ھ

پہلا مقالہ

اسلام میں نبوّت کا تصوّر

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ

(اے محمدؐ) کہہ دو کہ میں تمھاری ہی طرح ایک بشر ہوں،

(فرق صرف یہ ہے کہ مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔"

(القرآن: حم السجدہ)

دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس کی ہدایت ضروری تھی۔ اس کے لئے خدا نے اپنے پاکیزہ اور مقبول بندے بھیجے، ان سچے اور اچھے لوگوں کو پیغمبر یا نبی یا رسول کہتے ہیں۔ خدا ان کو تعلیم دیتا تھا اور یہ خدا کی تعلیم دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے۔

آج دنیا میں نیکی اور پاکیزگی کی جو بھی شعاعیں پائی جاتی ہیں وہ ان ہی انبیائے عظام کی عطا کی ہوئی ہیں۔ خدا کی عظمت کا احساس، اچھے بُرے کی تمیز، عدل و انصاف کی قدر، حتیٰ کہ آزاد خیال، بے دین اور ملحد لوگوں کی نکوکاری کا بھی بلاواسطہ یا بالواسطہ ان ہی کی برکتوں کا پرتو ہے، یہ دوسری بات ہے کہ اسے محسوس نہ کیا جائے یا اس کا اعتراف نہ کیا جائے۔

تمام انبیاء اپنے عہد کے بہترین انسان تھے، خدا ان سے راضی تھا، وہ خدا سے راضی تھے۔

اور اگرچہ بشریت میں وہ عام انسانوں ہی کی طرح تھے، مگر باطن اور معنویت میں بہت بلند تھے۔ امام غزالی نے نبوت کی حقیقت بیان کرتے ہوئے معراج القدس میں لکھا ہے کہ "نبوت انسانیت کے رتبہ سے بالاتر ہے، جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے۔" امام موصوف علیہ الرحمہ نے یہ بھی بتایا ہے کہ نبوت عطیۂ الٰہی اور موہبت ربّانی ہے اور سعی و محنت و کسب و تلاش سے نہیں ملتی۔"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :-

اَللّٰہُ یَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَہٗ (القرآن - الانعام)
اللہ بہتر جانتا ہے کہ کہاں وہ اپنی پیامبری کا منصب بنائے۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ (القرآن : جمعہ)
"یہ (نبوت) خدا کا فضل ہے وہ جس کو چاہے دے۔"

نبی کا مقام مصلح اور مفکر کے مقاموں سے بہت اعلیٰ اور ارفع ہے، تمام انبیاء پاکیزہ اور معصوم، گناہوں سے دور اور خطاؤں سے محفوظ تھے، ان کے سپرد گنہگاروں کی رہنمائی تھی۔ اگر وہ خود بھی گنہگار ہو سکتے تو اس سعادت کے مستحق کیسے ہوتے؟ جو خود اندھیرے میں ہو وہ دوسروں کو بھلا کیا روشنی دے سکتا ہے؟ اس کے برعکس اگر کسی مصلح یا مفکر کے دامن پر معصیت کے دھبے بھی ہوں تب بھی اس کے منصب میں کوئی فرق نہیں آتا، مثلاً ایک جیّد فلاسفر اور حریت کے علمبردار کی حیثیت سے سقراط کی تعظیم ہمیشہ ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی اگرچہ اس کی زندگی بہت مکروہ تھی۔

قرآن مجید میں بلا تفریق تمام انبیاء کی عفت کا اعلان کیا گیا ہے اور ان تمام شرمناک باتوں کو قلمزد کیا گیا ہے جو توریت، انجیل اور اکثر دوسری کتابوں میں ان معصوموں سے منسوب

کی گئی ہیں

وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ — "ان میں سے ہر ایک کو ہم نے صالح بنایا۔"

(القرآن: انبیاء)

كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ۔ (انعام) — "یہ سب صالحوں میں تھے۔"

وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ — "اور ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور سیدھی

اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (ایضاً) — راہ پر چلایا۔"

دوسرا فرق یہ ہے کہ مصلحوں اور مفکروں کے برخلاف انبیاء اپنے تمام افعال میں ہدایتِ ربانی کے تابع ہوتے تھے۔ نہ خود ان کی کوئی مرضی تھی نہ ارادہ۔ وہ وہی کہتے اور کرتے تھے جس کا انھیں خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا تھا۔

وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ — اور وہ اپنی خواہش نفسانی سے کلام نہیں

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝ — کرتا بلکہ وہی کہتا ہے جو اس کے خدا کی طرف

(القرآن: نجم) — سے کہا جاتا ہے۔"

خدا اور انبیاء کے درمیان پیام رسانی اور سفارت کا کام عموماً فرشتوں کی وساطت سے ہوتا تھا۔ خدا کے یہ فرمانبردار قاصد ایک اطاعت شعار اور بے اختیار محکوم کی طرح خدا کے احکام اس کے پیغمبروں تک پہنچاتے تھے۔

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ — "ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں جو مکرم اور

(القرآن: عبس) — برگزیدہ ہیں۔

لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ — اللہ جو ان کو حکم دیتا ہے وہ اس میں نافرمانی

وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ (تحریم) — نہیں کرسکتے اور وہی کرتے ہیں جس کا انہیں حکم دیا جاتا ہے۔

ان احکام کو وحی کہتے ہیں

"لسان العرب" میں وحی کے معنی حسب ذیل بتائے گئے ہیں :۔

"اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور جو کچھ تم دوسرے کے خیال میں ڈالو" یعنی منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا اور اگر الفاظ ہوں تو وہ اس قدر پوشیدہ ادا ہوں کہ کوئی دوسرا نہ سن سکے !

لیکن دینی اصطلاح میں لفظ 'وحی' کا اطلاق صرف ان باتوں پر کیا جاتا ہے جو خدا اپنے پیغمبروں پر اتارا کرتا تھا۔

ان آسمانی ہدایتوں میں کوئی نبی اپنی طرف سے ردّو بدل نہیں کر سکتا تھا۔ اور بفرض محال اگر کوئی نبی خدا کی طرف کبھی کسی ایسی بات کے منسوب کرنے کا ارادہ بھی کرتا جو اس کی طرف سے نہ ہوتی تو قبل اس کے کہ وہ اس پر عمل کر سکتا خدا اسکی زندگی ہی کا خاتمہ کر دیتا۔

وَلَوْ تَقَوَّلَ عَلَيْنَا بَعْضَ الْاَقَاوِيْلِ ۙ	اور اگر وہ کوئی جھوٹ اپنی طرف سے
لَاَخَذْنَا مِنْهُ بِالْيَمِيْنِ ۙ ثُمَّ	ملا کر کہتا تو ہم اس کا ہاتھ پکڑ لیتے اور
لَقَطَعْنَا مِنْهُ الْوَتِيْنَ ۖ فَمَا مِنْكُمْ	اس کی گردن کی شہ رگ کاٹ ڈالتے
مِّنْ اَحَدٍ عَنْهُ حٰجِزِيْنَ ۝	پھر تم میں سے کوئی اس کو ہم
(القرآن : حاقہ)	سے بچا نہ سکتا ۔"

دشمنوں کے شر اور فتنہ سے بھی خدا اپنے نبیوں کی حفاظت کرتا رہتا تھا اور ہر حال میں ان کی دستگیری فرماتا تھا، تاکہ شیاطین خواہ وسوسوں کی شکل میں خواہ جن و انس کی صورت میں ان کو گمراہ نہ کر سکیں۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّائِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّاۤ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ (القرآن: نساء)

"اور اگر تجھ پر اللہ کا فضل و کرم نہ ہوتا تو ایک گروہ نے تجھے گمراہ کرنے کا ارادہ کر لیا تھا اور وہ گمراہ نہیں کریں گے لیکن خود اپنے کو اور تجھے کچھ بھی نقصان نہ پہونچا سکیں گے۔

انبیاء کے سامنے نہ جاہ طلبی ہوتی تھی نہ حُبِّ مال، اپنی عدیم المثال خدمت کے معاوضے میں وہ عزت، شہرت، طاقت، حکومت اور مال و دولت کے بجائے لوگوں سے تقویٰ اور پرہیزگاری ہی مانگتے تھے۔ ان کا کام محض اللہ کے لئے تھا اور ان کا اجر بھی تمام تر اللہ ہی کے پاس تھا۔

يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى الَّذِيْ فَطَرَنِيْ ؕ (القرآن: ہود)

میں اپنی نصیحت کی تم سے اجرت نہیں مانگتا، میرا اجر تو اس پر ہے جس نے مجھے پیدا کیا۔"

يٰقَوْمِ لَاۤ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (ایضاً)

میں اپنی تبلیغ کے عوض میں تم سے مال و دولت کا خواہاں نہیں ہوں۔ میرا اجر تو بس خدا کے پاس ہے۔

سب سے بڑا فرق شخصیت اور منصب کی جامعیت کا ہے۔ مصلح کا فرض قوم میں ایک آدھ اصلاح جاری کر کے ختم ہو جاتا ہے، مفکر کا کام فکر کی انجمن میں نئی شمعیں روشن کرنا ہے، لیکن نبوت حیاتِ انسانی کے تمام گوشوں کی احاطہ گیر ہوتی ہے، یہ بات بھی دنیا نے پیغمبر اسلام کی وساطت سے جانی۔ یہودیوں کے وہاں نبوت

معنی پیش گوئی کے تھے۔ نبی وہ صرف اس کو کہتے تھے جس کی بابت اطلاع بالغیب کا عقیدہ رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ اس کی دعائیں اور بد دعائیں اثر کرجاتی ہیں، اسی اصول کی بنا پر وہ اکثر جلیل القدر انبیاء کے مقابلہ میں کاہنوں کو زیادہ قابل احترام خیال کرتے تھے، انجیل میں بھی نبوت کی کوئی صاف اور واضح تصویر نہیں پائی جاتی ہے، ورنہ یہ نہ کہا جاتا کہ مجھ سے پہلے جو آئے وہ چور اور ڈاکو تھے[۵]،

آنحضرت صلعم نے بتایا کہ انبیاء ہادی (رہنما) نذیر (ہشیار کرنے والے) داعی (خدا کی طرف بلانے والے) مبشر (خوشخبری سنانے والے) معلم (سکھانے والے) مبلغ (خدا کے احکام پہنچانے والے) نور (روشنی) مبین (خدا کی صفات بیان کرنے والے) مزکی (پاک و صاف کرنے والے) حاکم (فیصلہ کرنے والے) مطاع (واجب الاطاعۃ) آمر (حکم دینے والے) ناہی (منع کرنے والے) صاحب حکمت اور صاحب خُلقِ عظیم تھے۔

اسلام سے پہلے ہر قوم اس وہم میں مبتلا تھی کہ وہی خدا کی محبوب اور مخصوص قوم تھی اور صرف اسی کی سرزمین روحانی پیشواؤں کا مسکن بننے کے لائق تھی۔ باقی تمام قومیں فیوض ربانی سے محروم تھیں، ہندو آریہ ورت ہندوستان ہی کو دیوتاؤں کی جنم بھومی سمجھتے تھے۔ زرتشت نے ایرانیوں کے سوا ساری دنیا کو راندۂ درگاہ ٹھہرا دیا تھا، بنی اسرائیل خود کو خدا کا کنبہ سمجھتے تھے اور دوسری اقوام میں انبیاء کا مبعوث ہونا ان کے خیال ہی میں نہ آتا تھا، یہی حال عیسائیوں کا تھا، لیکن پیغمبر اسلام نے آکر بتایا کہ رنگ و نسل اور زبان و وطن کی تفریقیں خدا کی نظر میں بے حقیقت ہیں۔ تمام قومیں اسی کی خلق کی ہوئی ہیں، سب کی فلاح اسے یکساں عزیز ہے۔ اس نے اپنے پیغمبر دنیا کے

---

[۵] انجیل

ہر گوشے میں بھیجے ہیں اور کوئی قوم نور ہدایت سے محروم نہیں رہی ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولٌ (القرآن: یونس)	"اور ہر قوم کے لئے ایک رسول دیا ہے۔"
وَلَقَدْ بَعَثْنَا فِي كُلِّ أُمَّةٍ رَّسُولًا	"اور ہم نے یقیناً ہر قوم میں ایک
(نحل)	رسول بھیجا۔"
وَإِن مِّنْ أُمَّةٍ إِلَّا خَلَا فِيهَا	اور کوئی قوم نہیں جس میں ایک ہشیار
نَذِيرٌ (فاطر)	کرنے والا نہ آیا ہو۔"
وَمَا أَرْسَلْنَا مِن رَّسُولٍ إِلَّا بِلِسَانِ	اور ہم نے ہر پیغمبر کو اس کی قوم کی بولی
قَوْمِهِ لِيُبَيِّنَ لَهُمْ	میں بھیجا تاکہ وہ ان کو بتا سکے۔

یہ سلسلۂ نبوت پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر آخری پیغمبر یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہوا، نبیوں کی مجموعی تعداد کا تعین مشکل ہے قرآن میں بہت سے نبیوں کا تذکرہ پایا جاتا ہے مگر یہ فہرست محض نمونہ کے طور پر ہے اور اس میں وہی نام گنائے گئے ہیں جن سے اہلِ عرب یا ان کی ہمسایہ قومیں، یہود اور نصرانی پہلے سے واقف تھے۔ بعض مسلمان مصنفین نے پیغمبروں کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے اور بعض نے اس سے کم، لیکن اس بارہ میں یقین کے ساتھ کچھ کہنا احتیاط کے خلاف ہے، اسی طرح مختلف قوموں کی ان باعظمت ہستیوں کے نبی ہونے یا نہ ہونے کی بابت بھی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا جن کا ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے، مگر ان کے نبی ہونے کا امکان ضرور ہے

ہم پر تمام انبیاء کا احترام فرض ہے، لیکن بد قسمتی سے اکثر مذاہب اس سلسلہ میں اپنے پیرووں کی تنگ نظری کا شکار ہو گئے ہیں۔ یہودیوں پر حضرت موسیٰ کے علاوہ

کسی اور نبی کا اقرار ضروری نہیں رہا ہے۔ ہندو تمام غیر ہندو انسانوں کو ملیچھ اور چنڈال سمجھ کر بھی بہترین ہندو رہ سکتے ہیں۔ مسیحی حلقوں میں تو گویا پیغمبر اسلام کی تحقیر ہی بڑائی کی پہچان بن گئی ہے۔ غرض کہ عام طور پر ایک مذہب کے ماننے والے اپنے دائرہ کے باہر کے کسی نبی کی عزت و توقیر ضروری نہیں سمجھتے، لیکن مسلمان ایسا نہیں کر سکتے ان پر تمام انبیاء کی تعظیم ویسے ہی واجب ہے جیسے کہ خود اپنے نبی کی تعظیم، اور یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ کچھ کو مانیں اور کچھ کو نہ مانیں۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ	بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا
وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ اللَّهِ	انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور
وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ	اس کے رسولوں میں فرق کریں اور کہتے ہیں
وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ أَنْ	کہ ہم بعض کو مانیں گے اور چاہتے ہیں کہ
يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا	کہ اس کے بیچ بیچ کوئی راستہ نکالیں
أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا	وہی تو حقیقت میں کافر ہیں۔

(القرآن: نساء)

بقول علامہ سید سلیمان ندوی کوئی شخص اس وقت تک محمدی نہیں ہو سکتا جب تک وہ موسوی، عیسوی ..... نہ بن لے۔ اور کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا کے تمام پیغمبروں کی یکساں صداقت، حقانیت، راست بازی اور معصومیت کا اقرار نہ کرے۔ اور یہ یقین نہ کرے کہ ان کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے عرب کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا کہ خدا کا ماننا[1]

---

[1] سیرۃ النبی، چہارم جلد، صفحہ ۵۸۹

(۲)

اپنے سارے فضائل واوصاف کے باوجود انبیاء انسان ہی تھے، وہ خدا یا خدا کے بیٹے، یا خدا کے اوتار نہ تھے، در اصل انبیاء میں الوہیت کا ادنیٰ سا شائبہ بھی تسلیم کر لینے کے بعد توحید اور نبوت کی حیثیتیں ہی مشتبہ نہیں ہو جاتی ہیں اور خدائی کی یکتائی کا تصور ہی مجروح نہیں ہو جاتا ہے بلکہ انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی ختم ہو جاتا ہے اور ان کی زندگیاں ہمارے لئے کچھ زیادہ مفید نہیں رہتیں۔

مثلاً حضرت عیسیٰؑ کی سیرت کتنی پاکیزہ نظر آتی ہے، ان کی معصومیت اور بے نفسی ان کے عفو اور درگزر، صبر و توکل اور حلم اور بردباری کا ہمارے اوپر کتنا اچھا اثر پڑ سکتا ہے، لیکن الوہیت کا رنگ دینے کے بعد ان کا حسن ضائع ہو جاتا ہے۔

اگر اناجیل ہی کے بیان کو معیار قرار دیا جائے تو الوہیت کے معیار پر حضرت عیسیٰ کی زندگی عجیب حسرت ناک منظر پیش کرتی ہے۔ خدا اور بندوں کے آگے بے بس ہو، اس پر ظلم کے پہاڑ ٹوٹیں، اس کی توہین ہو، اور وہ عاجزی اور لاچاری کا مرقع بنا رہے! حد یہ ہے کہ خدا ماننے کے بعد ان کے حیرت انگیز معجزے بھی بے حقیقت معلوم ہونے لگتے ہیں، کیونکہ ان خوارق کی قدر و قیمت صرف اس وقت تک رہتی ہے جب تک کہ ان کو بہ تائید غیبی ایک برگزیدہ انسان ہی کی برکات و کرامات سمجھا جائے، ورنہ قدرت خداوندی کی ان سے کہیں زیادہ عجیب و غریب باتیں تو دن رات نظر آتی رہتی ہیں۔

حضرت عیسیٰؑ کے صحیفۂ حیات میں کوئی بات بھی تو نہیں ملتی جو اہلِ کلیسا کے اس دعوے کی تصدیق کر سکے کہ وقتِ مقررہ پر خدائے قادر و توانا گوشت اور خون کا لباس پہن کر ان کی ہیئت میں ظاہر ہوا تھا عیسائی مبلغین اس سلسلہ میں اکثر ان کے معجزات کی طرف اشارہ

کرتے ہیں لیکن صدورِ خوارق حضرت عیسیٰ ہی کا طرۂ امتیاز نہ تھا، تمام انبیاء اس سے ممتاز ہوئے ہیں اور انجیل میں بھی دوسرے پیغمبروں کی بابت ایسی ہی باتیں بیان کی گئی ہیں کہ وہ مُردوں کو زندہ اور لاعلاج مریضوں کو تندرست کر دیتے تھے اور ان کی ضرب سے سمندر پھٹ جاتا تھا" وغیرہ وغیرہ تو کیا ان سب کو عیسائی حضرات خدا یا خدا کے بیٹے یا خدا کے اوتار ماننے پر تیار ہیں؟

علاوہ ازیں، کسی نبی کو خدا یا خدا کے اوتار کا مقام دینے کے بعد اس کی زندگی ہمارے لئے نمونہ اور مثال کے کام کی نہیں رہتی، کیونکہ ہم بہر حال اسی کی اقتدا کر سکتے ہیں جو قوتِ اختیار کے معاملہ میں ہمارے ہی جیسا ہو، یا دوسرے لفظوں میں ہم اُسی کے نقشِ قدم کو خضرِ راہ بنا سکتے ہیں جس کے قدم ہم سے مختلف نہ ہوں، مختلف الجنس مخلوق ہم کو مرعوب تو کر سکتی ہے مگر رہنمائی اور رہبری نہیں کر سکتی اور نہ وہ ہماری آئیڈیل بن سکتی ہے۔ مثلاً شیر یا ہاتھی ہم کو سہما سکتے ہیں، خوف زدہ کر سکتے ہیں اور کبھی کبھی پسندیدگی اور رشک کے جذبات بھی پیدا کر سکتے ہیں لیکن ہم ان کو اپنا ہیرو بنانے سے معذور ہیں، کیونکہ ہم لاکھ چاہیں شیر یا ہاتھی بننا ہمارے امکان میں نہیں ہے۔[1]

آئیڈیل یا ہیرو کا تعین کسی ایک ذات میں وہ تمام اچھائیاں جمع کر کے جو مختلف افراد میں نظر آتی ہیں اور اس میں سے تمام برائیاں خارج کر کے کیا جاتا ہے تاکہ وہ اپنے ہمجنسوں میں نمونہ اور مثال کا کام دے سکے۔ اوتاروں میں چونکہ ایسی طاقتیں یقین کی جاتی ہیں جن پر دوسرے انسانوں کو قدرت نہیں ہوتی اس لئے انھیں منتہائے انسانیت یا انسانوں کے آئیڈیل یا ہیرو بنا لینا درست نہیں ہو سکتا ہے۔ انسان عملاً اپنی زندگی ان کے نمونہ پر ڈھال لینے سے ہمیشہ معذور رہے گا۔

---

[1] خواجہ کمال الدین "آئیڈیل پرافٹ" THE IDEAL PROPHET

انبیار انسانوں میں مبعوث ہوتے تھے اور ان کے سپرد انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی ہوتی تھی، ان کی دعوت کی کامیابی کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ تمام تر بشر ہی ہوتے اور .... زندگی کے نشیب و فراز سے گزرنے کے لئے اور مختلف دشواریوں کو عبور کرنے کے لئے وہ وہی تدبیریں اور وسیلے استعمال کرتے جو نوع انسانی کا خاصہ ہیں۔

خدا کے رسولوں کی بڑائی کا انحصار ان کے کائنات پر متصرف ہونے اور طرح طرح کے معجزے دکھانے پر نہیں بلکہ لوگوں میں حق اور غیر حق کی تمیز پیدا کر کے ان کی روحانی اور اخلاقی سطحوں کو بلند کرنے میں ہے۔ معجزات سے معارض کو لاجواب اور خاموش کیا جا سکتا ہے۔ لاجواب اور خاموش کر کے ہم دشمنوں کو زیر تو کر سکتے ہیں لیکن ان کے دلوں میں تسکین اور تشفی پیدا کرنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ تسکین اور تشفی کے لئے اتحادِ جنسیت ضروری ہے۔ یہی چیز دلوں کو کھینچتی ہے، اضطراری اور عارضی طور پر نہیں بلکہ عادتاً اور مستقلاً اور ان میں نیکی اور سچائی کے عناصر پیدا کرتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

موجبِ ایماں نباشد معجزات
بوئے جنسیت کند جذبِ صفات
معجزات از بہرِ قہرِ دشمن است
بوئے جنسیت سوئے دل بردن است
قہر گردد دشمن اما دوست نے
دوست کے گردد بہ بستہ گردنے

اسلام سے پہلے انبیار کو غیر از بشر سمجھنے کا عام دستور تھا، ان کی بابت انسانوں کے بجائے انسانوں کے بھیس میں خدا یا فرشتہ ہونے کا عقیدہ رکھا جاتا تھا اور یہی غلط تصور

لوگوں کو ان پر ایمان لانے سے روکتا تھا۔ قرآن مجید نے اس کی نفی کی۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ۝ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (القرآن: بنی اسرائیل)

ہدایت آجانے کے بعد لوگوں کو اس کے قبول کرنے سے اسکے علاوہ اور کوئی امر مانع نہیں ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ایک بشر کو اپنا رسول بنا کر بھیجا ہے، کہہ دو کہ اگر زمین پر فرشتے بستے ہوتے تو البتہ ہم کسی فرشتے ہی کو ان کے پاس رسول بنا کر بھیجتے۔"

یعنی رہبری اور قیادت کے لئے اشتراک جنسیت ضروری تھا، چنانچہ تمام انبیاء اپنے تمام جسمانی خصائص یعنی جینے، مرنے، بیمار پڑنے اور صحت یاب ہونے، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے چلنے پھرنے، صورت شکل، ہاتھ پاؤں وغیرہ کے اعتبار سے خالص بشر ہی تھے۔

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ ۝ (القرآن: الانبیاء)

"ہم نے ان کا جسم ایسا نہ بنایا تھا کہ وہ کھانا نہ کھائیں اور وہ ہمیشہ زندہ رہنے والے بھی نہ تھے۔"

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ اِلَّا رِجَالًا نُّوْحِيْٓ اِلَيْهِمْ مِّنْ اَهْلِ الْقُرٰى ۔ (القرآن:

اور ہم نے تم سے پہلے جو رسول بھیجے تھے وہ بشر ہی تھے آبادیوں کے رہنے والے، ہم ان پر وحی کرتے تھے۔

یہ ہدایت دراصل نئی نہ تھی لیکن نبوت کا مافوق الفطرت تصور اتنا قوی تھا کہ ہر نبی کو اس کا از سر نو سامنا کرنا پڑتا تھا، حضرت نوح علیہ السلام پر بھی انکی قوم کی جرح یہی تھی کہ

مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا

"ہم تو تجھے اپنے ہی جیسا بشر دیکھتے ہیں۔"

(القرآن: ہود)

اور جواب میں انھوں نے یہی فرمایا تھا کہ :-

وَلَآ اَقُوۡلُ لَکُمۡ عِنۡدِیۡ خَزَآئِنُ اللّٰہِ وَلَآ اَعۡلَمُ الۡغَیۡبَ وَلَآ اَقُوۡلُ اِنِّیۡ مَلَکٌ (ایضًا)	میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے قبضہ میں خدا کے خزانے ہیں، نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔"

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی صاف کہہ دیا تھا کہ :-

اِنِّیۡ عَبۡدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الۡکِتٰبَ وَ جَعَلَنِیۡ نَبِیًّا۔ (القرآن: مریم)	میں اللہ کا بندہ ہوں - اللہ تعالیٰ نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا۔"

پھر بھی جب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلانِ نبوت کیا تو ان کی قوم تعجب سے پکار اٹھی کہ :-

اَبَعَثَ اللّٰہُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا (القرآن: بنی اسرائیل)	"خدا نے (تو) انسان کو پیغمبر بنا کے بھیجا ہے؟"
أَبَشَرٌ یَّھۡدُوۡنَنَا (تغابن)	"کیا انسان ہماری رہنمائی کریں گے؟"
وَقَالُوۡا مَالِ ھٰذَا الرَّسُوۡلِ یَاۡکُلُ الطَّعَامَ وَیَمۡشِیۡ فِی الۡاَسۡوَاقِ ؕ لَوۡلَآ اُنۡزِلَ اِلَیۡہِ مَلَکٌ فَیَکُوۡنَ مَعَہٗ نَذِیۡرًا اَوۡ یُلۡقٰۤی اِلَیۡہِ کَنۡزٌ ..... (فرقان)	اور لوگوں نے کہا کہ یہ پیغمبر کھانا کیوں کھاتا ہے اور کیوں بازاروں میں چلتا پھرتا ہے کیوں اس پر ایک فرشتہ نہیں اترا جو اس کے ساتھ لوگوں کو ڈرانے والا ہو، یا اس پاس خزانہ کیوں نہیں اتارا جاتا ....."

اس کج ذہنی کے پیشِ نظر آنحضرت صلعم نے عبدیت کو اپنے اوپر اس قدر غالب کر لیا

اور انبیاء کی بشریت کا اعادہ آپ نے اس صفائی اور شدت سے کیا کہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے روشنی میں آگیا اور کم از کم مسلمانوں کے لئے نبوت اور الوہیت کے مفہوموں میں غلطی کرنے کا امکان باقی نہ رہا۔ قرآن کی یہ آیات ملاحظہ ہوں:-

هَلْ كُنْتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا (القرآن: بنی اسرائیل)	"میں تو ایک انسان پیغمبر ہوں۔"
قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ (کہف)	"کہدے کہ میں تمھاری طرح ایک بشر ہوں مجھ پر وحی کی جاتی ہے کہ تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔"
وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ (ایضاً)	"محمد تو صرف ایک رسول ہیں اور ان سے پہلے کئی ایک رسول گزر چکے ہیں۔"

دنیا کی تمام چیزوں پر انبیاء کو براہ راست قادر سمجھا جاتا تھا۔ غیب کا علم، نفع و نقصان پر اختیار، مارنے اور جلانے پر قدرت، ہوا میں اڑنا، خدا سے رُو در رُو باتیں کرنا، غرض تمام عجیب و غریب باتیں ان سے منسوب کی جاتی تھیں، اسلام نے ان اوہام و خرافات کی بھی بیخ کنی کی۔

قُل لَّا أَقُولُ لَكُمْ عِندِي خَزَائِنُ اللَّهِ وَلَا أَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَا أَقُولُ لَكُمْ إِنِّي مَلَكٌ إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ إِلَيَّ۔ (القرآن: انعام)	"اے پیغمبر کہہ دو کہ میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں، میں تو اس حکم کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔"

قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ۔ (اعراف)

"اے پیغمبر ان لوگوں سے کہدے کہ خود میرا نفع ونقصان میرے قبضۂ اختیار میں نہیں لیکن جو خدا چاہے اور اگر میں غیب کی باتیں جانتا تو خود اپنا بہت سا نفع کر لیتا اور نہ مجھ کو کوئی گزند پہنچتا۔"

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا... (القرآن: شوریٰ)

کسی بشر کے لئے ممکن نہیں کہ خدا اس سے رُو در رُو باتیں کرے، الایہ کہ وحی کے ذریعہ اپنا پیغام پہنچائے ... الخ

اقرار عبدیت کا یہ بھی کتنا اچھا اسلوب تھا جس کے اختیار کرنے کا رسول کو حکم ملا۔

اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ لَا شَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ (القرآن: انعام)

میری نماز میری قربانی، میری زندگی، میری موت اللہ ہی کے لئے ہے جو تمام عالم کا پالنے والا ہے۔ اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے اس کا حکم بردادوں میں ہوں۔

یا یہ کہ "اے اللہ میں بندہ ہوں تیرا اور بیٹا ہوں تیرے بندے کا، اور بیٹا ہوں تیری بندی کا، ہمہ تن تیرے قبضہ میں ہوں، نافذ ہے میرے بارے میں تیرا حکم عین عدل ہے میرے باب میں یہ فیصلہ ......![1]"

پیغمبروں کو خدائی یا نیم خدائی کا مرتبہ دینے کی بڑی حد تک ذمہ داری مقدس ہستیوں کی اعتدال سے بڑھی ہوئی تقدیس و تکریم پر ہے، معتقدوں کی غلو آمیز خوش عقیدگی

---

[1] طبرانی

اکثر اوقات دینی رہنماؤں کو معبود و مسجود کے مقام تک پہنچا دیتی ہے، پیغمبر اسلام نے اس خطرہ کا ساری عمر لحاظ رکھا، اور کبھی اپنی بے جا تعظیم کی اجازت نہ دی۔

آپ سے یہودیوں نے ایک بار دریافت کیا کہ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کی عبادت کیا کریں جس طرح عیسائی حضرت عیسیٰ کی عبادت کرتے ہیں؟" ارشاد ہوا۔ "معاذاللہ! میں اور غیر اللہ کی عبادت کا حکم دوں[1]"

یہ آیات قرآنی اسی وقت نازل ہوئی تھیں:۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ	"جس بشر کو خدا کتاب اور حکم اور نبوت عطا
الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ	کرے اس سے نہیں ہو سکتا کہ پھر وہ لوگوں
يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ	سے کہے کہ خدا کے سوا میرے بندے بن جاؤ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ	بلکہ اس کی ہدایت و دعوت یہی ہوتی ہے
بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا	کہ ہو جاؤ اللہ والے، مطابق اس کے کہ
كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ وَلَا يَاْمُرَكُمْ	پڑھتے پڑھاتے ہو اللہ کی کتاب۔ وہ ہرگز
اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ	یہ نہیں کہتا کہ فرشتوں کو یا نبیوں کو بھی رب
اَرْبَابًا اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ	بنا لو، بھلا وہ کفر کے لئے کہہ سکتا ہے بعد
اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ؀	اس کے کہ تم اللہ کے فرمانبردار بندے
(القرآن: آل عمران)	بن چکے ہو؟

ایک دوسرے موقع پر ایک صاحب نے بارگاہ نبوت میں عرض کیا کہ "جو خدا چاہے اور آپ چاہیں"۔ انھیں فوراً ٹوکا گیا کہ "تم نے مجھے خدا کا شریک اور ہمسر ٹھہرا دیا

[1] رحمۃ للعالمین، جلد اوّل، ص ۲۴۷

کہو کہ جو تنہا خدا چاہے[1]"۔

ایک صحابی قیس بن سعد کو حیرہ جانے کا اتفاق ہوا، وہاں انھوں نے دیکھا کہ لوگ جب رئیس شہر کے دربار میں جاتے ہیں تو سجدہ کرتے ہیں۔ لوٹ کر آئے تو حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ کو سجدہ کیا جائے تو آپ زیادہ مستحق ہیں۔" جواب ملا "تم میری قبر پر گذرو گے تو سجدہ کرو گے؟"۔ کہا، جی نہیں۔" آنحضرت صلعم نے فرمایا "تو پھر جیتے جی بھی سجدہ نہ کرنا چاہیئے۔"[2]

ایک بار حضور کہیں جا رہے تھے، راستہ میں آپ کو دیکھ کر ایک شخص پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ کانپنے لگا۔ آپ اس کے قریب تشریف لے گئے اور فرمایا "ڈرو نہیں میں ایک ایسی قریشی خاتون کا بیٹا ہوں جو خشک گوشت کے ٹکڑے کھایا کرتی تھی۔"[3]

یہی وہ بوئے جنسیت ہے جس کے بغیر صحیح عقیدت کے صحیح جذبات پیدا نہیں ہوتے اور عقیدت کے صحیح جذبات پیدا کئے بغیر کسی نبی یا مصلح کی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔

انبیاء اور صالحین کی پرستارانہ تعظیم و تکریم اگرچہ ان کو خدائی کے مرتبہ تک نہیں پہنچا سکتی مگر ان کو کوئی نقصان بھی نہیں پہنچا سکتی، البتہ ان کے نیازمندوں اور معتقدوں کے لئے بے حد ضرر رساں اور ان کو گمراہی کی پستی میں دھکیلنے والی اور خدا سے دور کرنے والی چیز ہے، قرآن مجید میں یہودیوں اور عیسائیوں کی مذمت کرتے ہوئے ان کا بڑا جرم یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ:۔

اِتَّخَذُوٓا اَحۡبَارَهُمۡ وَرُهۡبَانَهُمۡ	انھوں نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں
اَرۡبَابًا مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ وَالۡمَسِيۡحَ	اور راہبوں کو اپنا رب بنا لیا ہے اور
ابۡنَ مَرۡيَمَ۔ (القرآن: توبہ)	مسیح بن مریم کو خدا قرار دیا ہے۔

---

[1] امام بخاری۔ ادب المفرد [2] ابوداؤد۔ کتاب النکاح [3] ترمذی

چنانچہ اپنی بابت رسول اللہ صلعم کا یہ مستقل حکم تھا کہ "میری شان میں اس طرح مبالغہ نہ کرو جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے نبیوں کی شان میں کیا ہے"۔[1]

خدا کی ہمسری یا اس کی مشیت میں دخیل ہونا کیسا، آپ نے خود کو اس کے سامنے ہمیشہ عاجزوں سے زیادہ عاجز اور بے بسوں سے زیادہ بے بس ظاہر کیا ہے اور ایسا ہی ہونا بھی چاہیئے تھا، کیونکہ جو شخص جس قوت کا جتنا زیادہ علم رکھتا ہے اس سے اتنا ہی زیادہ ڈرتا ہے۔

حضرت سعد آپکے خاص مقرب تھے، آپ نے قبا میں ان ہی کے مکان پر قیام فرمایا تھا، لہٰذا جب سلہ ھ میں ان کا انتقال ہوا تو آپ کو بہت رنج پہنچا، یہودیوں نے اس پر طعنہ دیا کہ اگر محمد (صلعم) واقعی خدا کے رسول ہوتے تو اس صدمہ میں کیوں مبتلا ہوتے، آپ نے سنا تو فرمایا "میں خدا کے یہاں اپنے اور اپنے ساتھیوں کیلئے کوئی اختیار نہیں رکھتا"۔[1]

اپنی عقل و دانائی پر انسان کتنا ہی نازاں کیوں نہ ہو، اس میں عجیب و غریب باتوں سے متاثر ہونے کا مادہ، عارضی ہی طریقہ پر سہی ــ پایا جاتا ہے۔ اکثر وہ ان چیزوں کے آگے سر جھکا دیتا ہے جن کو وہ غیر معمولی سمجھے۔ اور جو اس کے قیاس و تجربہ سے بالاتر ہوں اور اسکے برعکس وہ بات جو مافوق الفطرت نہ ہو اپنی صداقت کے باوجود کبھی کبھی اس کی روح کو متوجہ کرنے سے قاصر رہتی ہے، اسی لئے پیغمبروں کو دوسری تدبیروں کے ساتھ معجزوں سے بھی کام لینا پڑتا تھا، عربوں میں ناخواندگی اور جہالت کے باعث یہ کمزوری بالخصوص نمایاں تھی، اور وہ ہر غیر معمولی بات دیکھکر سہم جایا کرتے تھے۔ آنحضرت صلعم کے دور میں بھی بہت سے ایسے واقعات رونما ہوئے جنھوں نے ان کے اوہام زدہ ذہنوں کو چونکا دیا اور وہ خوف زدہ ہو کر آپ کی رسالت کے قائل ہو گئے، مگر آپ نے ان

---

[1] طبری۔ ص ۱۲۶۲

خیالات کی ہمیشہ تردید کی اور لوگوں کو سوچنے اور سمجھنے کی نصیحت فرمائی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی صاحبزادے نہ تھے، ایک صاحبزادہ پیدا ہوئے جن کا نام آپ نے ابراہیم رکھا، یہ قدرتی طور پر آپ کو بہت محبوب تھے لیکن اللہ کی مشیت کہ دودھ پینے ہی کے زمانے میں ان کا بھی انتقال ہوگیا۔ آپ کو بہت صدمہ ہوا، اتفاق سے اسی دن اس زور کا سورج گرہن پڑا کہ بالکل اندھیرا چھا گیا۔ عربوں میں قدیم زمانے سے یہ خیال رائج تھا کہ سورج گرہن کسی عظیم المرتبت شخص کے مرجانے سے پڑا کرتا ہے، اس لئے اس واقعہ سے کفار اتنا متاثر ہوئے کہ ان میں سے کچھ آپؐ کے پاس گئے اور اپنی مخالفت کی معافی چاہی، آپ چاہتے تو ان کو فوراً اسلام میں داخل کر لیتے لیکن اسلام نے چونکہ دین کی بنیاد تفکر و تدبر پر قائم کی تھی اور نبی کے ذمہ حیوان عاقل کو اس کے پروردگار کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت سے نہ کہ کرشمہ سازی سے دعوت دینا رکھا تھا، اسلئے آپؐ نے یہ پسند نہ فرمایا اور لوگوں کو جمع کر کے اس کے متعلق ایک مستقل خطبہ دیا، جس میں لوگوں کو آگاہ کیا کہ سورج اور چاند خدا کی نشانیاں ہیں، کسی کے مرنے یا جینے سے ان میں گہن نہیں لگتا۔[۱]

(۳)

اسلام سے قبل ولایت اور نبوت کے آلۂ شفاعت ہونے کا ایک بہت غلط تصور پھیلا ہوا تھا، اس کا خاص سبب یہ خیال تھا کہ جو نسبت ایک مطلق العنان بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہوتی ہے کم وبیش وہی خدا اور اس کے بندوں کے درمیان بھی ہے اور جس طرح ایسے بادشاہوں کے دربار میں مقربوں اور سفارشیوں کے بغیر رسائی نہیں ہو سکتی اسی طرح بارگاہ خداوندی میں بھی درمیانی وسائل کے بغیر شنوائی ہونا محال

---

[۱] اس خطبہ کے الفاظ صحیح بخاری کتاب کسوف میں محفوظ ہیں ان مقالات کے آخر میں بھی اسے شامل کر دیا گیا ہے۔

ہے، یہ درمیانی وسائل ان لوگوں کے نزدیک دیوی، دیوتا، پیغمبر اور راہب وغیرہ تھے۔
اس لئے ان لوگوں کی پرستش کراتے تھے اور کہتے تھے:۔

مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى۔ (القرآن۔ زمر)
"ہم ان کو صرف اس لئے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کا تقرب حاصل کرادیں"

هٰؤُلَاءِ شُفَعَاؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ (یونس)
"یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں"

طبیعتیں جب انسانوں میں خدائی اوصاف دیکھنے کی عادی ہوجاتی ہیں تو وہ خدا کا اندازہ بھی انسانی عادات واطوار پر لگانے لگتی ہیں۔ لوگ ظاہر پر غیب کو قیاس کر لیتے ہیں اور دنیاوی تجربات کی بنا پر خدائی معاملات کی بابت فیصلہ کرنے لگتے ہیں۔ اسکے علاوہ انسان خود فریبی کی حد تک آسان پسند ہے۔ وہ دشوار مگر صحیح کے مقابلہ میں آسان مگر غلط کی طرف جلد مائل ہوجاتا ہے چنانچہ اسے آخرت کے خوف سے چھٹکارہ پانے کا یہ طریقہ بہت پسند آیا کہ اپنے رہناؤں کی سفارش وشفاعت پر کلی تکیہ کرلے۔

عیسائیوں میں آج بھی کفارہ کا عقیدہ عام ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کو نجات دہندہ سمجھتے ہیں، اس پر بحث کرنا ہمارا موضوع نہیں ہے، ہم اسکے متعلق صرف دو عیسائی مفکرین ہی کی رائیں نقل کرنے پر اکتفا کریں گے۔

سرآرتھر کینن ڈائل (SIR ARTHUR CANON DOYLE) نے لکھا ہے کہ:۔

"کسی کافر فرقہ نے بھی اس سے زیادہ بھونڈی بات نہیں اختراع کی کہ انسان موروثی گناہ کا داغ لے کر پیدا ہوا تھا جس کے لئے وہ بذاتِ خود ذمہ دار نہ تھا اور جس کے لئے کفارہ کی ضرورت تھی، اور

رب العالمین کو مجبوراً اپنے بے گناہ فرزند کی جان قربان کرنا پڑی تاکہ اس پُر اَسرار لعنت کے اثر کو زائل کیا جا سکے۔"[۱]

اور ربیکا وِسٹ (REBECCA WEST) کا قول ہے کہ میرے نزدیک

"میرے نزدیک کفّارہ کا عقیدہ مہمل ہے۔"[۲]

اب کفّارہ اور شفاعت کے اس عقیدہ کے متعلق قرآنی بیانات ملاحظہ ہوں:۔

وَلَا يَمْلِكُ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهِ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ۔ (زخرف)

یہ لوگ خدا کو چھوڑ کر جن کو پکارتے ہیں وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، ہاں مگر وہ جس نے شہادت دی حق کی۔

وَكَمْ مِنْ مَّلَكٍ فِى السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِىْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا (نجم)

اور کتنے فرشتے ہیں آسمانوں میں کہ ان کی شفاعت کچھ فائدہ نہیں پہنچاتی۔"

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ٥ (زمر)

"کیا ان کافروں نے غیر اللہ کو شفیع بنایا ہے؟ کہہ دے کہ اگر یہ کچھ اختیار اور سمجھ بوجھ نہ رکھتے ہوں تو بھی (شفیع بننے کے قابل ہیں؟)

قیامت کے دن جب سارے پردے اٹھ جائیں گے تو ان کی مایوسی اور سراسیمگی دیکھنے کے قابل ہوگی جو خدا کے علاوہ کسی اور کو اپنی شفاعت کا ضامن سمجھے بیٹھے تھے۔

وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يُبْلِسُ الْمُجْرِمُوْنَ ٥ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ مِّنْ شُرَكَآئِهِمْ شُفَعٰٓؤُا وَكَانُوْا

اور جب قیامت قائم ہوگی تو مشرکین مایوس ہو کر رہ جاویں گے اور جن کو وہ خدا کا شریک کار بتاتے تھے ان میں سے

۱؎ ڈیلی ایکسپریس مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۲۵ء (ماخوذ از آئیڈیل پرافٹ ص ۴) ۲؎ ماخوذ از آئیڈیل پرافٹ ص ۵

بِشِرْکَآئِھِمْ کٰفِرِیْنَ ٥	کوئی ان کا شفیع نہ ہوگا" اور یہ انکار
(روم)	کریں گے ان شرکاء سے

خاص کر یہودیوں کو ڈرایا گیا کہ :-

وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ	اے بنی اسرائیل ... ڈرو اس دن سے
عَنْ نَّفْسٍ شَیْئًا وَّلَا یُقْبَلُ	جس میں کوئی کسی کے ذرا بھی کام نہ آئیگا
مِنْھَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُھَا	اور نہ اسکی طرف سے کوئی بدلہ قبول
شَفَاعَۃٌ (بقرہ)	ہوگا اور نہ شفاعت فائدہ دے گی"

اور عیسائیوں کو جو یہ یقین رکھتے ہیں کہ مسیح کے جانشینوں یعنی پوپوں اور پادریوں کے سامنے اعتراف گناہ کرنے سے مغفرت ہو جاتی ہے، سمجھایا گیا کہ :-

وَمَنْ یَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰہُ	(اور) خدا کے سوا گناہوں کو کون معاف
(آل عمران)	کرسکتا ہے"

ان کے اس عقیدہ کی تردید کرتے ہوئے کہ "روز قیامت خدا کا بیٹا یعنی مسیح خدا کے داہنے ہاتھ پر بیٹھ کے عدل و انصاف کرے گا" بتایا گیا کہ واقعہ یوں ہوگا کہ خدا حضرت عیسیٰ سے دریافت فرمائے گا کہ کیا تم نے لوگوں کو یہ تعلیم دی تھی ؟ — اور وہ عرض کریں گے کہ اے پروردگار! میں نے تو ان کو وہی ہدایت دی تھی جس کا تو نے حکم دیا تھا اب

اِنْ تُعَذِّبْھُمْ فَاِنَّھُمْ عِبَادُکَ	"اگر تو ان کو سزا دے تو یہ تیرے بندے
وَاِنْ تَغْفِرْ لَھُمْ فَاِنَّکَ اَنْتَ	ہیں اور اگر تو بخشدے تو (تو سب کچھ
الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ٥ (مائدہ)	کرسکتا ہے کہ) تو غالب اور حکمت والا ہے"

الغرض اسلامی تعلیم یہ ہے کہ مغفرت کا معاملہ بس خدا کے ہاتھ ہے، کوئی دوسرا اس میں

دخیل نہیں۔ انبیاء کی شفاعت کا یہ خود مختارانہ تصور اور عقیدہ باطل ہے، خدا جسے چاہیگا اپنی رحمت سے نوازے گا اور جسے چاہے گا اُسے سزا دے گا، البتہ اس کی اجازت اور رضامندی سے اس کے رسول اور صالحین دوسروں کے حق میں شفاعت کر سکیں گے۔

مَامِنْ شَفِيْعٍ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اِذْنِهٖ (یونس)	"خدا کی بارگاہ میں کوئی شفیع نہیں لیکن اس کی اجازت کے بعد۔"
مَنْ ذَا الَّذِیْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (بقرہ)	وہ کون ہے جو خدا کے سامنے کسی کی شفاعت کر سکے، لیکن اس کی اجازت سے۔"

اور یہ شفاعت بھی ہر شخص کے لئے نہ ہو سکے گی، صرف وہی اس سے فیض یاب ہونگے جن کو خدا چاہے گا۔

وَلَا يَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى وَهُمْ مِّنْ خَشْيَتِهٖ مُشْفِقُوْنَ ٥ (انبیاء)	"اور وہ شفاعت نہیں کریں گے علاوہ اس کے جس کے لئے خدا اپنی خوشنودی ظاہر کرے اور وہ اسکے خوف سے ترساں ہونگے۔"

اور جن کا جرم خدا کے نزدیک ناقابل معافی ہوگا ان کے حق میں کسی کی بھی دعا یا سفارش کارگر نہیں ہو سکتی، چنانچہ بعض منافقین کے لئے آپ نے دعاء مغفرت کی تو جواب ملا :۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ (توبہ)	"تم ان کی مغفرت چاہو یا نہ چاہو۔ اگر تم ان کے لئے ستر دفعہ بھی مغفرت چاہو گے تو خدا ان کی مغفرت نہ کرے گا۔"

تکرار قرآن کا ایک خاص اسلوب ہے، شفاعت کے مسئلہ میں بھی یہی اسلوب اختیار کیا گیا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں پر بار بار اور طرح طرح سے روشنی ڈالی گئی ہے ... تاکہ

خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت آپ کے بعد کسی طرح کی غلط فہمی میں گرفتار نہ ہو سکے۔

ہر شخص کو اپنے اعزّا اور احباب کی فلاح محبوب ہوتی ہے۔ حضور کو بھی فطرتاً اپنے اعزّا کی مغفرت کی فکر رہتی تھی۔ چنانچہ آپ نے اپنے بعض ایسے قریبی عزیزوں کے لئے دعائے مغفرت کرنا چاہی جنکو اسلام کی دولت نصیب نہیں ہوئی تھی تو آپ کو اس کی اجازت نہیں ملی[1]۔

نیز اسی خیال سے کہ آپ کے اقربا شرف قرابت کی وجہ سے خوف آخرت سے غافل نہ ہو جائیں آپ نے ان کو جمع کر کے نصیحت فرمائی کہ اے قریشیو! اے اولاد عبد المطلب (آپ کے دادا) اے عباس (آپ کے چچا)! اے صفیہ (آپ کی پھوپھی)! اے فاطمہ (آپکی صاحبزادی)! میرے مال سے جو مانگو میں دے سکتا ہوں لیکن خدا کے یہاں میں تمھارے لئے کوئی اختیار نہیں رکھتا[2]۔

نیز اپنے بارے میں بھی فرماتے تھے کہ:۔

"میں پیغمبر ہو کے بھی نہیں جانتا کہ میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا"[3]

——— (۴) ———

مختلف انبیاء اپنے ساتھ اصول دین کے علاوہ شریعتیں بھی لاتے تھے۔ اصولِ دین کا تعلق خدا کی ہستی، اس کی صفات کاملہ، اس کی خالص عبادت، رسولوں کی بعثت، یوم آخر، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا جیسے بنیادی اور اصولی امور سے ہے اور شرع کے معنی راستے کے ہیں۔ یہ اصول دین کے مقابلہ میں ثانوی حیثیت کی چیز ہے اور اصل مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الجنائز [2] بخاری [3] بخاری

سارے پیغمبر ایک ہی خدا کے فرستادہ ہونے کے باعث اصولاً ایک ہی پیغام لیکر آتے تھے، یعنی اصولی طور پر ان سب کی ایک ہی دعوت تھی اور سب کا ایک ہی دعویٰ تھا۔ چنانچہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد علیہم السلام تک جتنے سچے مذہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے اور اسلام اسی ایک مذہب کا نام ہے۔ جو اختلاف ان مذاہب میں بعد میں پیدا ہوا وہ در اصل خود انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے جن کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف نے دین اور اسکے ساتھ انسانیت کے ٹکڑے کر ڈالے ہیں اور خدا کی بہترین مخلوق کو بے شمار فرقوں اور گروہوں میں بانٹ دیا ہے۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى — اس نے متعین کر دی ہے تمہارے لئے
بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِىٓ اَوْحَيْنَآ — دین کی وہی راہ جس کا حکم نوح کو دیا تھا
اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيمَ — اور جسکی ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا حکم
وَمُوسٰى وَعِيسٰى۔ الآیۃ۔ (شوریٰ) — ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا۔ الخ

مگر جزئیات احکام یعنی شرع یا منزل مقصود تک پہنچنے کا راستہ ہر مذہب اور قوم کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب بدلتا رہتا تھا۔ گویا ایک ہی روشنی مختلف محفلوں میں وقت اور شرکائے محفل کے تقاضہ اور مذاق کے اعتبار سے مختلف قندیلوں میں سے چھن چھن کر آتی تھی۔

لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً — ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک
وَّمِنْهَاجًا ط (مائدہ) — دستور العمل اور ایک راستہ بنا دیا۔

اس آیت سے ایک طرف یہ واضح ہوتا ہے کہ راستوں کا اختلاف منزل کے مختلف ہونے کی دلیل نہیں ہے اور دوسری طرف یہ کہ شرعی احکام و قوانین کے اختلافات بھی

خدا ہی کی طرف سے تھے اور ان میں انبیاء کی رائے یا پسند کو دخل نہ تھا، اور اگر اس نے آخر میں سب کے لئے ایک ہی دستور العمل بنا دیا تو یہ اس کا حق تھا ۔ انبیاء صرف شارح تھے شارع نہیں۔ ان کا منصب اور کام خدا کے قانون کی تشریح اور وضاحت اور اسی قانون کی روشنی میں لوگوں کے دلوں میں خوف پیدا کرنا تھا، قانون وضع کرنا نہیں۔

مَا عَلَی الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلَاغ "ہمارے رسول پر صرف پیغام پہنچا دینا ہے"

(مائدہ)

اِنَّ اَنْتَ اِلَّا نَذِیْر (رعد) "اے رسول، تو تو صرف ڈرانے والا ہے"

—— ۵ ——

غرضکہ نبوت کے اسلامی تصور کا لب لباب یہ ہے کہ انبیاء نہ خدا تھے، نہ خدا کے بیٹے، نہ خدا کے اوتار، نہ خدا کے شریک نہ اس کے ہم پلہ و ہمسر اور نہ وہ بنی اسرائیل کے پیغمبروں کی طرح خدا سے کشتی ہی لڑتے تھے[۱]۔

انبیاء خدا کے بندے اور اس کے عبد تھے۔ ہماری ہی طرح ایک بشر لیکن پاک و صاف، برگزیدہ و معصوم۔ خدا فتنہ اور شر سے ان کی حفاظت کرتا تھا، ان پر اپنے احکام نازل فرماتا اور وہ ان احکام کو قول سے اور عمل سے دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے ان سب کا دین واحد تھا، اگرچہ شریعتیں مختلف تھیں۔

خدا کے پیغام میں تبدیلی یا اضافہ کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا اور نہ وہ اپنی یا کسی اور کی بابت اس کے یہاں کوئی طاقت ہی رکھتے تھے، خدا کی مرضی، اسکی عادت و سنت اور اس کے حکم کے سامنے وہ ایسے ہی بے دست و پا تھے جیسے کہ ہم اور آپ۔

---

[۱] توراۃ آیت ۲۲ تا ۲۹) میں حضرت یعقوبؑ کا خدا سے کشتی لڑنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں یہ صداقتیں اتنی نمایاں اور واضح ہیں کہ جبکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ، حضرت موسیٰ کلیم اللہ اور حضرت عیسیٰ روح اللہ کے القاب سے مشہور ہوئے آپ کا مستقل لقب ہی عبد اللہ پڑ گیا۔

یہ معتدل اور متوازن تعلیم انسانوں کے حق میں کتنی مبارک ثابت ہوئی اور ان میں حق پرستی حریتِ فکر اور خود اعتمادی کی اعلیٰ صلاحیتوں کی افزائش میں اس سے کیا مدد ملی اس کا اندازہ اس خطبہ سے ہوتا ہے جو خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیقؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر دیا تھا۔[1]

مَنْ کان یَعْبُدُ محمّداً فانَّ محمّداً قد مات وَمن کان یَعْبُدُ اللہ فان اللہ حیٌّ لایموت ــــ وَمَا محمّدٌ اِلّا رسولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قبلہ الرُّسُلُ اَفَاِن مات او قتل انقلبتم علیٰ اعقابکم وَمن ینقلب علیٰ عقبیہ فلن یضر اللہ شیئاً وسیجزی اللہ الشاکرین۔

(اے لوگو!) جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی عبادت کرتا تھا اس کو معلوم ہونا چاہئے کہ محمد کا انتقال ہو گیا ہے اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اللہ بے شک زندہ ہے اسکو کبھی موت نہیں (اللہ تعالیٰ فرما چکا ہے کہ) محمد صرف رسول ہی تو ہیں (اور) ان سے پہلے کتنے ہی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ مر جائیں یا شہید کر دیئے جائیں تو تم الٹے پاؤں پھر جاؤ گے؟ اور یاد رکھو جو کوئی ایسا کرے گا وہ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا! اور اللہ ان لوگوں کو عنقریب اچھا صلہ دیگا جو شاکر رہیں گے۔

---

[1] بخاری، باب مرض النبی

دوسرا مقالہ

حیاتِ طیبہ[1]

ولادت سے ہجرت تک

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ

"پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا"

(القرآن: علق)

شرق اوسط کی اہمیت عہد حاضر کی سیاست ہی کی پیداوار نہیں ہے، پرانی دنیا میں بھی اسے مرکزی حیثیت حاصل تھی۔

اس خطہ کا قلب وہ حصہ ہے جو خلیج فارس، بحیرہ عرب، بحیرۂ قلزم اور بحیرہ روم سے قریب قریب گھرا ہوا ہے، یہ علاقہ پرانی دنیا کے وسط میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے مقام اتصال پر واقع ہے، اسی لئے اسے پرانے زمانہ میں "دنیا کی ناف" کہتے تھے۔

قدیم ترین زمانہ سے اس جزیرہ نما میں بڑی بڑی تہذیبیں پیدا ہوتی رہیں اور ایشیا کے

دوسرے ملکوں اور یورپ اور شمالی افریقہ میں جو مختلف تہذیبیں پروان چڑھیں وہ یہاں آکر ایک دوسرے سے گلے ملتی رہیں، جب بحیرۂ روم اور بحر ہند کے درمیان ساری تجارت خشکی کے راستے سے ہوتی تھی۔ اس وقت شام، فلسطین، حجاز، یمن اس بڑی شاہراہ پر واقع تھے جو مغرب سے مشرق کو ملاتی تھی اور یہاں کے لوگوں کو دنیا کے تمام حصوں سے تعلقات پیدا کرنے اور ان پر اثر ڈالنے کے ایسے مواقع حاصل تھے جو دوسری قوموں کو نہ تھے، بین الاقوامی تہذیب اور عالمگیر انسانی برادری کا تصور اگر دنیا میں کہیں پیدا ہو سکتا تھا تو اسی وسطی خطہ میں، چنانچہ چھٹی صدی عیسوی میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو امن و اخوت کا مژدہ یہیں سنایا۔

اسلام سے پہلے عرب میں کبھی کوئی باقاعدہ حکومت قائم نہیں ہوئی تھی۔ ظہور اسلام کے وقت اس کے سرحدی علاقے ـــ اور ملک بھر میں وہی علاقے سرسبز و شاداب تھے ـــ غیروں کے قبضے میں تھے۔ شمال میں حدود شام پر روما کی مشرقی شاخ سلطنتِ قسطنطنیہ کا اقتدار تھا اور مشرق میں یمن، عمان اور بحرین فارس کے زیر نگین تھے، وہاں کے عرب رؤسا کی حکمرانی بس برائے نام تھی۔ ملک کے اندر بھی ایرانیوں کا اثر رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا، اس کا اندازہ اس فرمان سے ہوتا ہے جو ۶ھ میں شاہ ایران نے آنحضرت صلعم کے متعلق یمن کے ایرانی گورنر کے نام جاری کیا تھا کہ "میرے غلام کو جو حجاز میں مدعیٔ نبوت بنا ہوا ہے گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔"

عربوں کا سیاسی اور معاشرتی نظام قبائلی طرز کا تھا، وہ مختلف قبیلوں میں بٹے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک سردار تھا۔ شمال میں بکر، شیبان، لخم، تغلب، جذام، بنو حنیفہ طے، اسد، ہوازن، اوس، خزرج، ثقیف اور قریش وغیرہ آباد تھے، جنوب میں حمیری

اذواء اور اقیال کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں، پہاڑوں اور صحراؤں میں خودمختار، جرائم پیشہ قبائل کی ٹکڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ رہزنی اور غارتگری ان کا ذریعۂ معاش تھا سب سے زیادہ طاقتور یہودی تھے جو شام اور فلسطین پر رومی مسیحیوں کا تسلط ہو جانے کے بعد وسطِ ملک میں بچھڑ آئے تھے، ملک کی زیادہ تر تجارت ان کے قبضہ میں تھی، اور انھوں نے شام سے مدینہ تک قلعے تعمیر کر لئے تھے جو گوداموں کا کام بھی دیتے تھے اور چھاؤنیوں کا بھی۔

عرب قبائل مستقل آپس میں لڑا کرتے تھے، معمولی معمولی باتوں پر ان میں جنگ و جدال کا ایسا سلسلہ شروع ہو جاتا تھا جو برسوں ختم ہونے کو نہ آتا تھا۔ ان خانہ جنگیوں کے باعث بہت سے قبیلے تو مٹ ہی گئے تھے اور جو بچے تھے ان کی بھی حالت تباہ تھی۔

رہزنی اور لوٹ مار کو اگر الگ کر دیا جائے تو لوگوں کا ذریعۂ معاش تجارت تھی، لیکن جہاں بدامنی کا یہ حال ہو وہاں تجارت کیا فروغ پا سکتی تھی، تجارتی قافلوں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا سخت دشوار تھا، حد یہ تھی کہ حیرہ کے عرب بادشاہ تک کا تجارتی سامان آسانی سے منڈیوں میں نہیں پہنچ پاتا تھا، اکثر طاقتور قبیلے برسوں اپنے مقدس شہروں کا رخ نہ کر پاتے تھے۔

مذہب کے معاملہ میں عام رجحان بت پرستی کی طرف تھا، ارواح خبیثہ سے لیکر چاند سورج تک سبھی کی پرورش کی جاتی تھی اور ان کے ناموں پر انسانوں تک کی قربانی کی جاتی تھی، زراعت میں زمین کا بہترین حصہ ان کے لئے وقف کر دیا جاتا تھا، خود خانہ کعبہ —— دنیا کے بتکدہ میں پہلا وہ گھر خدا کا —— تین سو ساٹھ دیویوں اور دیوتاؤں کا استھان بن گیا تھا۔

یوں تو عربوں میں ایک مدت سے یہودیت، مجوسیت اور مسیحیت کا چرچا

تھا، لیکن ان کا کوئی مفید اثر ان کے عادات و اخلاق پر نہیں پڑ سکا تھا۔
سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) لکھتے ہیں کہ " مدت العمر سے مکہ اور کل جزیرہ نما روحانی غنودگی کے عالم میں تھے، یہودیت اور مسیحیت اور فلسفہ نے جو ادنیٰ اور عارضی اثر عرب ذہن پر ڈالا تھا وہ بس ان لہروں کی طرح تھا جو کبھی کبھی جھیل کی سطح پر نمودار ہو جاتی ہیں۔ سطح کے نیچے کا جمود ویسے ہی قائم رہا تھا[۱]"

عرب کے باہر دنیا کی حالت بھی کچھ اچھی نہ تھی۔ روم اور فارس یہی اس زمانہ کی دو بڑی طاقتیں تھیں، فارس کی سلطنت عراق سے لیکر ہندوستان کی سرحد تک پھیلی تھی، اور یورپ، ایشیا اور افریقہ تینوں براعظموں پر رومیوں کا غلبہ تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں برابر جنگیں ہوا کرتی تھیں جن سے ان کے وسائل کی بربادی ہوتی رہتی تھی اور دنیا کا امن چین غارت ہوا کرتا تھا۔

فارس میں بعثت سے قبل قباد اوّل بن فیروز کی حکومت تھی، اسکی نااہلی سے تنگ آکر رعایا نے اسکو قید کر دیا۔ قباد نے بھاگ کر تاتاریوں میں پناہ لی اور ان کی مدد سے دوبارہ تخت وتاج حاصل کیا۔ چھٹی صدی کے وسط میں قباد کی جگہ نوشیرواں نے لی، اس کا عدل مشہور ہے، مگر درحقیقت اس کے ہاتھوں لاتعداد بے گناہ موت کے گھاٹ اترے، اس کا بیٹا نوشزاد تثلیث پرستی کی طرف مائل تھا۔ وہ اس کی پاداش میں قید ہوا اور بالآخر زردشتیوں سے جنگ کرتا ہوا مارا گیا۔ ۵۷۹ء میں نوشیرواں کی موت کے بعد ہرمز چہارم تخت نشین ہوا مگر بدنظمی اور سیاسی انحطاط کی روز افزوں ترقی کو وہ بھی نہ روک سکا۔

---

[۱] سر ولیم میور "لائف آف محمد" (SIR WILLIAM MUIR LIFE OF MOHAMMAD)

رومیوں کی عالمگیر سلطنت جو یونانیوں کے زوال کے بعد قائم ہوئی تھی چوتھی صدی عیسوی کے شروع میں مشرقی اور مغربی دو حصّوں میں تقسیم ہو گئی تھی اور مشرقی بازو کے فرمانروا قسطنطین نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ اسکی وفات کے بعد خانہ جنگیوں کی آگ بھڑکی اس طوائف الملوکی سے فائدہ اٹھا کر دور دراز کے صوبوں نے بغاوت کر دی اور سلطنت کا مغربی حصّہ بالکل جُدا ہو گیا۔ ادھر گوتھ اور ونڈال جیسی وحشی قوموں نے قتل و غارت کا وہ بازار گرم کیا کہ پانچویں صدی ختم ہوتے ہوتے سلطنت روما کا وہی حال ہو گیا جو عام طور پر ہر سلطنت کا اس کے آخری دور میں ہو جایا کرتا ہے۔

ساتویں صدی کی ابتدا میں رومیوں پر ایرانیوں نے اتنا سخت حملہ کیا کہ آناً فاناً اناطولیہ شام، فلسطین اور مصر ان کے قبضہ سے نکل گئے اور دار السلطنت قسطنطنیہ کا ایرانیوں نے محاصرہ کر لیا۔ مجبور ہو کر شہنشاہ ہرقل نے ایرانی سپہ سالار کی صلح کی انتہائی توہین آمیز شرطوں کے سامنے سر جھکا دیا اور سونے چاندی کے علاوہ ایک ہزار نا کتخدا لڑکیاں بھی ایرانیوں کے حوالہ کیں۔

روحانی اور اخلاقی طور پر دنیا سچ مچ ایک ظلمتکدہ تھی، یورپ پر قرون وسطیٰ کا اندھیرا چھایا ہوا تھا، ایران پر مزدکیت مسلّط تھی اور ہندوستان پرانتک عہد کی تاریکی میں بھٹک رہا تھا۔

یہودیت کو جو فروغ داؤد علیہ السلام کے عہد میں حاصل ہو گیا تھا وہ بالکل عارضی ثابت ہوا اور ان کے بیٹے حضرت سلیمان کے دور ہی میں ان کی تاریخ مظلومی اور جلاوطنی کی داستان بننا شروع ہو گئی تھی۔ پہلی صدی عیسوی میں فلسطین ان سے خالی ہو گیا تھا اور چوتھی صدی کے آغاز میں قسطنطین اعظم کے عیسائی ہو جانے کے بعد ان کی قومیت کہیں بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ عہد سلیمانی ہی میں ان میں بت پرستی رائج ہو گئی تھی۔ وہ صحیفۂ ربانی یعنی توریت سے محروم ہو چکے تھے اور حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز راہبوں کے

فیصلہ پر مبنی تھی جو شرعی فتاوی کا کاروبار کرتے تھے، انبیاء کی تکذیب، سود خوری، تجارت میں بے ایمانی، عہد شکنی، محسن کشی اور منافقت ان کے نسلی کردار کی خصوصیتیں بن گئی تھیں۔ قرآن مجید میں ان کی دینی اور اخلاقی پستی کی بار بار مذمت کی گئی ہے۔

وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ الْحَقِّ	اور وہ ناحق پیغمبروں کو مار ڈالتے ہیں
ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا	اس لئے کہ وہ نافرمان اور حد سے
یَعْتَدُوْنَ ہ (سورہ بقرہ)	بڑھنے والے ہیں۔
سَمّٰعُوْنَ لِلْكَذِبِ اَكّٰلُوْنَ	اور جھوٹ باتوں کے سننے والے اور
لِلسُّحْتِ (سورۂ مائدہ)	حرام مال کے بڑے کھانے والے ہیں
وَتَرٰى كَثِیْرًا مِّنْهُمْ یُسَارِعُوْنَ	اور تو ان میں سے اکثر کو دیکھے گا کہ
فِی الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ	گناہ اور تعدی کی طرف بڑی تیزی
(سورۂ مائدہ)	سے بڑھتے ہیں۔
وَّاَخْذِهِمُ الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا	اور چونکہ وہ سود خوری کرتے ہیں حالانکہ
عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ	ان کو سود سے منع کر دیا گیا تھا اور چونکہ
بِالْبَاطِلِ (سورۂ نساء)	وہ لوگوں کا مال خرد برد کر جاتے ہیں۔

مسیحیت آئی تھی بت پرستی کا انسداد کرنے مگر خود اس کا شکار ہو گئی تھی حضرت عیسیٰ کی تشریف بری کے بعد ان کے شاگردوں میں ایسے گہرے اختلافات پیدا ہوئے کہ انھوں نے مذہب کو کئی ٹکڑوں میں بانٹ ڈالا۔ پولوس اور اس کے بعد اسکے شاگرد رشید پطرس نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات میں رومیوں کی اصنام پرستی اور یونانیوں کی فلاطونیت کا رنگ بھر کر توحید کی جگہ تثلیث کو رائج کیا، جگہ جگہ مذہبی کاؤنسلیں قائم ہوئیں اور روما،

قسطنطنیہ، شام اور مصر کے اہل کلیسا ایک دوسرے کو خارج از دین ہونے کے فتوے دینے لگے۔ نوبت مناظروں سے گزر کر جنگ وجدال تک پہنچی اور چھٹی صدی عیسوی کی ابتدا میں عیسائیوں میں آپس میں ایسا تصادم ہوا کہ کم وبیش ایک لاکھ عیسائیوں کو جلاوطن ہونا پڑا۔

سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) لکھتے ہیں کہ "مسیحیت (خود) ساتویں صدی میں مجہول، کمزور اور ناکارہ تھی"[1] اور ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ "ساتویں صدی میں احمق عیسائیوں نے کفر سے کھلی ہوئی مشابہت پیدا کر لی تھی۔ وہ اپنی منتیں ان تمام بتوں کے حضور میں پیش کرتے تھے جو مشرقی عبادت گاہوں کی رسوائی کا سبب بنے ہوئے تھے اور انہی کے ناموں پر خلوت وجلوت میں قسمیں کھاتے تھے۔ خدائے قادر وتوانا کا تخت شہیدوں ولیوں اور فرشتوں کے ہجوم سے تاریک ہو رہا تھا"[2]۔

اس وقت تیسرا بڑا مذہب مجوسیت یعنی آتش پرستی تھی جو ایرانیوں میں شروع سے جاری تھی اور ان کی طویل وعریض سلطنت قائم ہو جانے پر دور دور پھیل گئی تھی۔ زردشت نے روشنی وتاریکی کی دو علیحدہ حیثیتوں پر خیر وشر کی جداگانہ حیثیتیں قیاس کر کے ان کے الگ الگ خدا یزداں اور اہرمن تصور کر لئے تھے، اس کے بعد مانی نے مسیحیت کے اشتراک سے ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالی جس کا اصل الاصول یہ تھا کہ ظلمت

---

[1] "لائیف آف محمد" (LIFE OF MOHAMMAD)

[2] ایڈورڈ گبن "ڈکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر" ـــــ حصۂ دوم (EDWARD GIBBON "DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE" VOL II)

یعنی بدی پر دائمی فتح پانے کی ایک یہی صورت تھی کہ نسل انسانی کا سلسلہ منقطع کر دیا جائے اور انسان کامل تجرّد کی زندگی بسر کریں۔ ترکِ ازدواج کے اس انوکھے فلسفہ کا ردعمل ضروری تھا اور پھر ایرانی جیسی قوم میں جہاں جنسی معاملات میں سدا سے آزادی چلی آرہی تھی اور باپ کا بیٹی کو اور بھائی کا بہن کو زوجیت میں لے لینا ایک معمولی بات سمجھا جاتا تھا چنانچہ ایرانی وقار کے ڈھلتے ہوئے عہد میں بعثت محمدیؐ سے کچھ قبل مزدک نے زر، زمین، زن کی مشترک ملکیت کا اعلان کیا اور عیش پرست اُمرا اور عوام دونوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ زر اور زمین کے معاملہ میں تو اسکی تعلیم کچھ زیادہ مقبول نہیں ہوئی مگر ہوس رانی اور آوارگی کا بازار خوب گرم ہوا اور ظلم و استبداد کی بھی حد نہ رہی۔

ہندوستان مہابھارت کی جنگ کے بعد بالکل ویران ہو گیا تھا، کہا جاتا ہے کہ یہ جنگ چار سو سال یعنی چودھویں صدی قبل مسیح تک کھنی رہی تھی اور سارے ملک میں کوئی شخص ایسا نہ تھا جس نے کسی ایک فریق کی طرف سے حصّہ نہ لیا ہو۔ چھٹی صدی ق۔م میں گوتم بدھ نے ہندوستان کو امن و آزادی کا نیا پیغام دیا۔ بدھ مت کے عروج کا زمانہ قریب قریب پانچویں صدی عیسوی تک رہا جس کے بعد کچھ تو اسکی ترکِ دنیا اور گداگری کی تعلیم اور کچھ برہمنوں کی مخالفت کے باعث اُسے دیس نکالا مل گیا اور پُرانک عہد کا آغاز ہوا۔ یہ دور ہندوستان کی تاریخ کا سب سے ناقص دور تھا۔ برہمنوں نے خود کو کل قانونی اور اخلاقی قیدوں سے آزاد کر لیا تھا۔ ان کو کسی حالت میں بھی موت کی سزا نہیں دی جا سکتی تھی جبکہ اچھوتوں کے لئے برہمنوں کو چھو لینا بھی سزائے موت کا حکم رکھتا تھا۔ برہمن کو گالی دینے والوں کی زبان کاٹ ڈالی جاتی تھی۔ اونچی ذات کا مرد ہر نیچی ذات کی عورت سے ہم بستر ہو سکتا تھا۔ امراء کے یہاں ناچ گانے کی محفلیں آراستہ رہتی تھیں اور شاہراہوں

پر آوارہ مزاج لوگوں کے ہجوم لگے رہتے تھے۔ ایک عورت کے متعدد شوہر ہو سکتے تھے۔ عورتوں کو مردوں کا غلام سمجھا جاتا تھا۔ اور تو اور وہ جوئے میں ہاری بھی جا سکتی تھیں، مندروں کے پجاری عقیدتمندوں کو لوٹتے تھے، جمادات و نباتات کی پرستش ہوتی تھی، خبیث روحوں پر عقیدہ رکھا جاتا تھا اور وباؤں کے زمانہ میں خاص طور پر انہی سے رجوع کیا جاتا تھا۔[1]

رات کے بطن سے دن، تاریکی کے بطن سے نور پیدا ہوتا ہے۔ دنیا کی یہ بوالعجبی درحقیقت اس کی حیات نو کا پیش خیمہ تھی۔ تاریخ تمدن کے ایک ماہر نے اس مفہوم کو ان الفاظ میں ادا کیا ہے کہ "معلوم ہوتا تھا کہ جس عظیم الشان تہذیب کو دنیا نے چار ہزار برسوں میں تعمیر کیا تھا وہ تخریب کی آخری حد کو پہنچ گئی تھی اور انسانیت اس دور کی طرف پھر لوٹ جانا چاہتی تھی جس میں نظم و نسق انجانی چیز تھے اور ہر قبیلہ اپنے ہمسایہ کے خون کا پیاسا رہتا تھا۔ پرانی قبائلی بندشیں ڈھیلی پڑ چکی تھیں، اس لئے قدیم شہنشاہی طریقے کارگر نہ ہوتے تھے۔ مسیحیت نے جو نئے اصول چلائے تھے وہ امن و اتحاد پیدا کرنے کے بجائے منافرت اور بدامنی کے محرک نکلے تھے، یہ دور بڑا المناک تھا۔ تہذیب کا دیو پیکر درخت جس کی شادابی عالم در کنار تھی اور جس کی شاخیں ادب اور سائنس کے بیش بہا پھل لایا کرتی تھیں اب خشک ہو رہا تھا، اس کے تنے کی قوتِ نمو زائل ہو چکی تھی... جنگوں نے اسکی جڑوں کو برباد کر ڈالا تھا اور وہ محض فرسودہ رسموں اور کھوکھلے رواجوں کے سہارے کھڑا تھا، ہر وقت اس کے گر پڑنے کا خطرہ تھا۔ کیا کوئی ذی روح تمدن ایسا تھا جس کے ذریعہ نوع انسانی کو ایک بار پھر یکجا کر کے تہذیب کو بچایا جا سکتا تھا؟ ضرورت اسکی تھی

---

[1] آر سی دت۔ اینشینٹ انڈیا (R. C. DUTT · ANCIENT INDIA)

"ستیارتھ پرکاش"

کہ یہ تمدن نئے طرز کا ہو، کیونکہ پرانے تصورات اور رسومات مر چکے تھے۔ اب ان کے نمونے پر دوسرے اصول اور طریقے مرتب کرنے کے لئے صدیاں درکار تھیں[1]۔"

چنانچہ چھٹی صدی کے آخری ثلث میں عرب کے قبیلہ قریش کی ہاشمی شاخ کے عبداللہ بن عبدالمطلب کے گھرانے سے آفتاب رسالت طلوع ہوا، جس نے آن کی آن میں تاریخ انسانی کی رات کو دن میں بدل دیا۔

۲

شہنشاہ کونین سیدنا و مولانا حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت کے بارہ میں مختلف روایتیں ہیں۔ قاضی محمد سلیمان سلمان منصورپوری کی تحقیق ہے کہ آپ موسم بہار میں دوشنبہ کے دن ۹ ربیع الاوّل عام الفیل، مطابق ۲۲ اپریل ۵۷۱ء و یکم جیٹھ سمت ۶۲۸ بکرمی کو صبح صادق کے بعد اور طلوع آفتاب کے قبل مکہ معظمہ میں پیدا ہوئے[2]۔ ......

آپ ماں کے پیٹ ہی میں تھے کہ یتیم ہو گئے۔ چھ سال کی عمر میں جب والدہ ماجدہ بھی انتقال فرما گئیں تو دادا نے آپ کو اپنے آغوش تربیت میں لیا۔ دو برس بعد وہ بھی دنیا سے منھ موڑ گئے۔ اب آپ کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری آپ کے چچا ابوطالب نے لی، وہ اپنے یتیم بھتیجے پر بےحد مہربان تھے، ہر وقت اپنے ساتھ رکھتے، ساتھ ہی کھلاتے اور ساتھ ہی سُلاتے۔

چونکہ اس زمانہ میں عربوں میں تعلیم کا دستور نہیں تھا، اسلئے آپ اُمّی ہی رہے

---

[1] ماخوذ از "ریکانسٹرکشن آف ریلیجس تھاٹ ان اسلام" از ڈاکٹر محمد اقبال
(RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM)

[2] رحمۃ للعالمین

سن شعور کو پہنچ کر جب کسب معاش کی فکر ہوئی تو آپ بھی اپنے خاندانی پیشے تجارت میں داخل ہو گئے۔ سرمایہ کی کمی کی وجہ سے ذاتی کاروبار ممکن نہ ہو سکا۔ دوسروں کی شرکت میں کام شروع کیا، تھوڑے ہی دنوں میں لوگ آپ کے قول کی سچائی، وعدہ کی پابندی اور معاملت کی صفائی کا دم بھرنے لگے، آپ کا لقب ہی "امین" پڑ گیا، تاریخ اور احادیث کی کتابوں میں اس دور سے تعلق رکھنے والی بیسیوں روایتیں پائی جاتی ہیں جو آپ کے اعلیٰ خصائل کی شہادت دیتی ہیں۔ ایفائے عہد کے سلسلے میں عبداللہ بن ابی الحمس کی روایت نے تو ضرب المثل کی شکل اختیار کر لی ہے، انھوں نے آپ کے ساتھ خرید و فروخت کا کوئی معاملہ کیا، کچھ بات ہو چکی تھی، کچھ باقی تھی کہ وہ پھر آنے کا وعدہ کر کے کہیں چلے گئے۔ اتفاق سے یہ بات ان کے ذہن سے اتر گئی، تیسرے دن جب وعدہ یاد آیا تو گھبرا کے جائے مقررہ پر پہنچے، آپ کو اسی جگہ منتظر پایا۔ دوسرا ہوتا تو کیا کچھ نہ کہتا۔ آپ نے صرف اتنا کہہ کر بات ختم کر دی "تم نے مجھے زحمت دی۔ میں تین دن سے یہیں تمھارا انتظار کر رہا ہوں[1]"۔

کچھ عرصہ بعد حضرت خدیجہؓ کے ساتھ آپ کا عقد ہو گیا، عقد کے موقع پر آپ کے چچا ابوطالب نے خطبہ پڑھا، انھوں نے کہا۔ "تحقیق محمد بن عبداللہ میرا بھتیجا ایسا جوان ہے کہ قریش میں کوئی دوسرا مرد اسکے مقابلہ کا نہیں ہے اور وہی سب سے فائق اور ممتاز ہے، اگرچہ اسکے پاس مال و متاع کم ہے[2]"۔

حضرت خدیجہؓ ایک دولت مند بیوہ تھیں، چنانچہ شادی کے بعد آنحضرت صلعم کو فکر معاش سے رہائی مل گئی اور آپ اپنا وقت غور و فکر اور لوگوں کی خدمت میں صرف کرنے لگے، ملک کی بد امنی کی طرف آپ نے توجہ فرمائی اور کچھ با اثر لوگوں کو ساتھ ملا کر ایک

---

[1] ابوداؤد ج ۲ ص ۳۲۶ [2] ریاض محمدیہ ص ۱۷

انجمن قیام امن کی خاطر قائم کی، اس انجمن کے ممبروں کو اس بات کا حلف لینا پڑتا تھا کہ "خدا کی قسم ہم سب مل کر ایک ہاتھ بن جائیں گے اور وہ مظلوم کے ساتھ رہ کر اس وقت تک ظالم کے خلاف اٹھا رہے گا جب تک ظالم مظلوم کا حق ادا نہ کر دے"۔ [1]

عہد نبوت میں اکثر آپ فرمایا کرتے تھے کہ "اگر آج بھی کوئی اس انجمن کی نام پر مدد کے لئے پکارے تو میں سب سے پہلے جاؤں گا"۔ [2]

پینتیس برس کی عمر میں خانہ کعبہ میں حجر اسود نصب کرنے والا واقعہ پیش آیا جس نے آپ کی عدل نوازی، فراست اور مصالحت کیشی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

کعبہ کی عمارت چونکہ نشیب میں تھی، اسلئے برسات میں شہر کا پانی صحن حرم میں بھر آتا تھا، اس کی روک کیلئے ایک بند بنوا دیا گیا تھا مگر وہ ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا اور عمارت کو بار بار نقصان پہنچتا تھا۔ آخر کو یہ طے پایا کہ پرانی عمارت گرا کر از سر نو تعمیر کی جائے عمارت کے بنانے میں تو سبھی قبائل نے مل کر شرکت کی لیکن جب حجر اسود کو نصب کرنے کا وقت آیا تو سخت اختلاف پیدا ہوا۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ یہ خدمت اسی کے ہاتھوں انجام پائے۔ بات بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچی کہ تلواریں کھنچ گئیں۔ عرب میں دستور تھا کہ جب کوئی شخص جان دینے کی قسم کھاتا تھا تو پیالہ میں خون بھر کر اس میں انگلیاں ڈبوتا تھا چنانچہ بعض پرجوش لوگوں نے یہ رسم بھی ادا کر لی۔ چار دن تک برابر یہی صورت رہی پانچویں دن ابوامیہ بن مغیرہ نے جو قریش میں سب سے زیادہ معمر تھا، رائے دی کہ کل صبح جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے اسی کو حکم مقرر کر دیا جائے ـــــ سب نے یہ رائے مان لی، دوسرے دن قبائل کے تمام معزز آدمی موقع پر پہنچ گئے۔ اب اتفاق کہئے یا

---

[1] روضۃ الالف

[2] رحمۃ للعالمین جلد ۱ صفحہ ۴۷

قدرتِ خداوندی کا کرشمہ کہ سب سے پہلے جو نظر آئے وہ آنحضرت صلعم ہی تھے۔ آپ کو دیکھنا تھا کہ لوگ خوش ہو کر پکار اٹھے۔ ھٰذا الامین رضیناہ (امین آگیا۔ ہم سب اس کے فیصلہ پر متفق ہیں) آنحضرت چاہتے تو یہ شرف تنہا خود حاصل کر لیتے۔ مگر آپ نے اسے پسند نہ فرمایا۔ آپ نے ایک چادر بچھائی اور اس پر حجر اسود کو اپنے ہاتھ سے رکھ دیا، پھر تمام دعویدار قبیلوں کے سرداروں سے کہا کہ وہ چادر کو پکڑ کر اٹھائیں۔ اسی طرح پتھر کو وہاں تک لایا گیا جہاں اسے نصب کرنا تھا۔ جب چادر موقع کے برابر آگئی تو آپ نے حجر اسود کو اٹھا کر نصب فرمادیا۔ آپ کے حسن تدبیر سے ایک خونخوار جنگ اتنی آسانی سے ٹل گئی۔[1]

آپ کا بچپن اور شباب دونوں بے داغ گزرے، یہ بات قطعی طور پر ثابت ہے کہ قبل بعثت بھی آپ تمام مشرکانہ رسوم اور دوسرے عیوب سے بالکل الگ رہے۔ آپ کے اس دور کے سارے احباب پاکیزہ اور اچھے لوگ تھے۔ سب سے زیادہ گہرے تعلقات حضرت ابوبکرؓ سے تھے جو برسوں شریک زندگی رہے تھے۔ سر ولیم میور بھی جو اسلام کی قدح کرنے والے مصنفوں کی پہلی صف میں شمار کئے جاتے ہیں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ ہماری تصنیفات محمدؐ کے چال چلن کی عصمت اور ان کے اطوار کی پاکیزگی میں جو اہل مکہ میں کمیاب تھیں، متفق ہیں۔[2]

بے داغ جوانی اور پاکیزہ اخلاق بالخصوص عرب کے اس فسق و فواحش کے ماحول میں بڑی چیز تھیں، مگر جس کے مقدر میں قوم کی رہنمائی ہو اسے کچھ اور بھی درکار

---

[1] صحیح بخاری ۔ باب ما ذکر فی الحجر الاسود

[2] لائف آف محمد

تھا۔ اسکی جستجو میں آپ کا انہماک بڑھتا گیا حتیٰ کہ دنیا کے مشغلے ہیچ نظر آنے لگے۔

مکہ سے تین میل پر ایک غار تھا جسے حرا کہتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کے دل کی اداسی جب زیادہ بڑھی تو آپ وہاں جاکر کئی کئی دن قیام فرمانے لگے، کھانے پینے کا سامان ساتھ لے جاتے اور جب وہ ختم ہو جاتا تو گھر جاکر پھر لے آتے اور عبادت میں مشغول ہو جاتے ..... یہ عبادت کیا تھی؟ وہی جو آپ کے جدِ امجد حضرت ابراہیمؑ نے نبوت سے پہلے کی تھی یعنی غور و فکر اور عبرت پذیری[1]۔"

"ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ (ON HEROES AND HEROWORSHIP) میں ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے اس عبادت کی یوں وضاحت کی ہے۔ "سفر و حضر میں ہر جگہ محمدؐ کے دل میں ہزاروں سوال اٹھتے رہتے تھے۔ میں کیا ہوں؟ یہ متناہی عالم کیا ہے؟ زندگی کیا ہے؟ موت کسے کہتے ہیں؟ میں کن چیزوں پر اعتقاد رکھوں؟ کیا کروں؟ کیا غار حرا کی چٹانوں یا طور کی چوٹیوں یا صحراؤں کے سکوت نے ان سوالوں کا جواب دیا؟ نہیں۔ گردش کرتا ہوا نیلا آسمان، چکر لگاتے ہوئے دن رات چمکتے ہوئے ستارے سب ان کا جواب دینے سے قاصر رہے[2]۔"

آخر ایک دن فرشتۂ غیب نے اسرار نبوت کے لئے آپ کا سینہ کھول دیا، اس نے آواز دی۔

اِقرأ باسمِ ربّكَ الّذی خلقَ۔ (سورۂ علق)	"پڑھ اس خدا کے نام سے جس نے کائنات کو پیدا کیا۔"

آپ جلال الٰہی سے کانپ اٹھے، سیدھے گھر آئے اور چادر اوڑھ کر لیٹ گئے۔ راز

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۱، صفحہ ۲۰۱
[2] ہیرو ایز آ پرافٹ، محمدؐ (HERO AS A PROPHET MOHAMMAD)

کی بات سننے کا بیوی سے زیادہ اور کون حقدار ہو سکتا تھا، آپ نے حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کیا اور فرمایا مجھے اپنی جان کا ڈر رہے ہے۔" حضرت خدیجہؓ نے ڈھارس بندھائی، انھوں نے کہا "آپ تردد نہ فرمائیں، آپ مہماں نواز ہیں، اقربا کی مدد کرتے ہیں، بیواؤں یتیموں اور بیکسوں کی دستگیری کرتے ہیں۔ سچ بولتے ہیں، خدا آپ کا ساتھ نہ چھوڑے گا۔"

حضرت خدیجہؓ کے ایک چچازاد بھائی ورقہ تھے جو بڑے ذی علم اور توریت اور انجیل کے ماہر تھے، بیچاری آنحضرت صلعم کو ان کے پاس لے گئیں، انھوں نے واقعہ کی کیفیت سنی تو کہا "یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰؑ اور عیسیٰؑ پر اترا تھا۔ تو آپ کو مبارک ہو کہ خدا نے آپ کو اپنا نبی بنایا ہے۔ عنقریب آپ کو تبلیغ کا حکم ملے گا، پھر ساری قوم آپ کی دشمن ہو جائے گی، کاش میں اس وقت جوان ہوتا۔"[1]

یہ واقعہ ۹ ربیع الاوّل ۴۱ھ میلادی مطابق ۱۲ فروری ۶۱۰ء کو بروز دوشنبہ پیش آیا تھا جب (قاضی سلیمان منصور پوری کے حساب سے) آپ کی عمر چالیس سال ایک دن کی تھی۔[2]

(۳)

جوناتھن سوِفٹ (JONATHAN SWIFT) نے یہ بات بہت دلچسپ کہی ہے کہ تم میں جب کوئی غیر معمولی آدمی ابھرے تو تم اسے اس علامت سے پہچان سکتے ہو کہ دنیا بھر کے گدھے اس کی مخالفت میں صف بستہ ہوں گے۔

آنحضرت صلعم انسانی فطرت کی اس خصوصیت سے واقف تھے، چنانچہ جب

---

[1] صحیحین ملخصاً
[2] رحمۃ للعالمین جلد ۱، صفحہ ۵۲

آپ کو تبلیغ اسلام کا حکم ملا تو آپ نے تدریج اور تدبیر سے کام لیا اور پہلے ان ہی لوگوں کو دین قیم پر لانے کی کوشش کی جو آپ سے بہت قریب تھے۔ یہ آپ کی بیوی حضرت خدیجہؓ، چچازاد بھائی حضرت علیؓ، آپ کے آزاد کردہ غلام حضرت زیدؓ اور دیرینہ رفیق حضرت ابوبکرؓ تھے جو سنتے ہی ایمان لے آئے۔

حضرت ابوبکر بڑے فیاض، صائب الرائے اور ذی اثر تھے۔ اچھے اچھے لوگ ان سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ وہ اسلام لائے تو ان کو دیکھ کر مکہ کے کچھ اور معززین بھی مسلمان ہو گئے، ان میں حضرت عثمانؓ جو بعد کو خلیفہ سوم ہوئے، حضرت سعد بن ابی وقاص جن کے ہاتھوں ایران فتح ہوا، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت عبد الرحمٰن بن عوف شامل تھے۔ ان کے بعد مردوں میں حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عامر بن عبد اللہ، حضرت عبد الاسدؓ بن بلال، حضرت عثمان بن مظعونؓ اور حضرت ارقمؓ اور عورتوں میں حضرت عباس کی بیوی ام الفضل، حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ اور حضرت فاروقؓ کی بہن فاطمہؓ کو مسلمان ہونے کا شرف نصیب ہوا۔ یہ وہ لوگ تھے جو فطرت کی سلامتی، معقولیت اور حق پسندی میں ممتاز تھے۔

سارا کام نہایت احتیاط اور خاموشی سے ہوا۔ اور رازداران خاص کے علاوہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوئی، نمازیں چھپ کر گھروں کے اندر یا پہاڑوں کی گھاٹیوں میں ادا کی جاتی تھیں۔ ایک روز آنحضرت صلعم اور حضرت علیؓ کسی گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ آپ کے چچا اور حضرت علیؓ کے والد ابوطالب آ نکلے، انہیں اس نئے طرز کی عبادت پر تعجب ہوا، نماز کے بعد انھوں نے پوچھا کہ "یہ کون دین ہے؟" آنحضرت صلعم نے جواب دیا "ہمارے دادا ابراہیمؑ کا یہی دین تھا۔" ابوطالب نے کہا "میں تو اسے

اختیار نہیں کر سکتا۔ لیکن تم کو اس کی اجازت ہے۔"[1]

تین برس تک اسلام کی اشاعت اسی طرح چپکے چپکے ہوتی رہی اور تیس آدمی اس کے حلقے میں داخل ہوئے، چوتھے سال حکم الٰہی صادر ہوا فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ (جو تجھے حکم دیا گیا ہے وہ بالاعلان کہہ دے) اور یہ بھی تاکید کر دی گئی کہ رشد و ہدایت کی راہ پہلے گھر، پھر کنبہ اور قبیلہ سے گزر کر عوام الناس تک پہنچتی ہے۔ وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (اور اپنے قرابت داروں کو اللہ سے ڈرا)

چنانچہ آپ نے اپنے گھر پر دعوت کا انتظام کیا اور عبدالمطلب کے کل خاندان کو مدعو کیا، کھانے کے بعد آپ نے ایک مختصر سی تقریر کی، آپ نے فرمایا۔ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جس میں دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی ہے۔ اس بارِ عظیم کو اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟" —— محمد بن عبداللہ اور یہ دعوے! سننے والوں پر سناٹا چھا گیا۔ یکایک حضرت علیؓ نے اٹھ کر کہا۔ "اگرچہ مجھ کو آشوب چشم ہے اور میری ٹانگیں پتلی ہیں اور میں سب سے زیادہ نوعمر ہوں مگر میں آپ کا ساتھ دوں گا۔" اس وقت حضرت علیؓ کا سن شریف محض تیرہ سال تھا۔ لوگ ان کا مذاق اڑانے لگے، کچھ لوگوں نے ابوطالب سے کہا "لو، اپنے بھتیجے اور بیٹے کا حکم سن لیا۔ اب اسکے خلاف نہ کرنا۔" اور اس تمسخر اور ناگواری کی فضا میں مجلس برخواست ہو گئی۔

کچھ روز بعد آپ نے کوہِ صفا پر چڑھ کر قریش کو آواز دی اور جب لوگ جمع ہو گئے تو آپ نے فرمایا "تم میری بابت کیا رائے رکھتے ہو، مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا؟" آپ کی ساری زندگی انہی میں گزری تھی۔ وہ آپ کے صحیفۂ حیات کے ایک ایک ورق

---

[1] سیرۃ النبی جلد ۱، صفحہ ۲۰۷

سے واقف تھے۔ سب ایک زبان ہو کر بولے "ہم نے کبھی تمھارے منھ سے کوئی جھوٹی یا بیہودہ بات نہیں سنی۔ ہم جانتے ہیں کہ تم سچے اور امین ہو۔" تب آپ نے فرمایا "اگر میں تم سے کہوں کہ اس پہاڑی کے پیچھے دشمن کا لشکر چھپا ہوا ہے تو کیا تم میری بات مان لوگے؟" لوگوں نے جواب دیا "ہم تم کو سدا سے سچا سمجھتے آئے ہیں، تم اونچی جگہ پر کھڑے ہو اور پہاڑ کے اس طرف کا حال دیکھ سکتے ہو، جو ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔" آپ نے فرمایا "تو پھر میں یہ کہتا ہوں کہ خدا ایک ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں ہے، موت برحق ہے اور مرنے کے بعد اسی کے سامنے حاضر ہونا ہے، اگر ان باتوں پر ایمان لاؤ گے تو فلاح پاؤ گے اور دنیا اور آخرت میں سرخرو ہو گے ورنہ تم پر بڑا عذاب نازل ہوگا۔" لوگ یہ سن کر بہت برہم ہوئے۔ انھوں نے کہا "کیا ہمیں اسی لئے بلایا تھا؟ بیکار ہمارا وقت برباد کیا۔" اور منتشر ہو گئے۔

مسلمانوں کی تعداد اب چالیس سے کچھ اوپر ہو گئی تھی، ایک دن آپ نے کعبہ میں جا کر توحید کا اعلان کر دیا جو قریش کے نزدیک اس کی سب سے بڑی توہین تھی، وہ ہر طرف سے آپ پر ٹوٹ پڑے، حضرت حارث گھر پر تھے۔ ان کو خبر ہوئی تو دوڑے ہوئے آئے اور آنحضرت صلعم کو بچانا چاہا۔ مگر ان پر اتنی تلواریں پڑیں کہ گر کر وہیں شہید ہو گئے۔ یہ پہلا خون تھا جو اسلام کی راہ میں بہا۔

خانۂ کعبہ میں کلمۂ حق کا اعلان گویا قریش کو کھلا چیلنج تھا، عرب میں مکہ کی عظمت کعبہ ہی کے سبب سے تھی، قریش اس کے مجاور اور کلید بردار تھے۔ اس طرح عربوں پر اُن کی ایک قسم کی مذہبی حکومت تھی۔ وہ آل اللہ یعنی خاندان الٰہی کہلاتے تھے۔ اپنے آبائی عقائد کے خلاف جو سنا تو آگ بگولہ ہو گئے اور سنا بھی تو کس سے؟ ایک ایسے

شخص سے جو پیدا ہونے سے پہلے یتیم ہو گیا تھا، جس کے پاس اتنا پیسہ نہ تھا کہ خود اپنا روزگار کر سکتا، جس کے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی ـــــ یہ آخری بات کچھ کم اہم نہ تھی، کیونکہ تمام جاہل قوموں کی طرح عرب بھی اولاد نرینہ کو افضلیت اور آخرت کی خوش نصیبی کی نشانی سمجھتے تھے۔

قریش کہتے تھے کہ اگر ان میں نبی کو مبعوث ہونا ہی تھا تو یہ منصب قبیلہ کے کسی رئیس کو ملتا

وَقَالُوْا لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ	اور انھوں نے کہا کہ قرآن کو اترنا تھا تو
عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ	ان دونوں شہروں (مکہ و طائف) میں
(سورۂ زخرف)	سے کسی رئیس پر اترنا تھا۔

دو چار کو چھوڑ کر اسلام کے ابتدائی دور میں ایمان لانے والے معمولی قسم کے آدمی تھے جن کی نہ تو قبیلہ میں کوئی ممتاز حیثیت تھی اور نہ وہ مال و دولت ہی کے مالک تھے۔ رؤسائے قریش ان کو دیکھتے تو ہنس کر کہتے۔

اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ	کیا یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا نے ہم کو چھوڑ کر
مِّنْۢ بَيْنِنَا (سورہ انعام)	احسان کیا ہے۔

وہ تو خیریت یہ ہوئی کہ بعثت سے کچھ قبل ہی قریش میں فجار کی زبردست جنگ ہو چکی تھی جس میں اس کثرت سے کشت و خون ہوا تھا کہ طرفین نے ہار جیت کا انتظار کئے بغیر گھبرا کر صلح کر لی تھی۔ اسکے زخم ابھی تازہ تھے، ورنہ دعوت دین کے ساتھ ہی مکہ میں حشر برپا ہو جاتا۔

چنانچہ قریش نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور ان کے ایک وفد نے ابو طالب کے پاس

جا کر آنحضرت صلعم کی شکایت کی۔ ابو طالب نے سمجھا بجھا کر واپس کر دیا۔ مگر جب آنحضرتؐ کی مساعی میں کمی کے بجائے ترقی ہی ہوتی گئی تو وہ پھر ابو طالب کے پاس گئے اور اس مرتبہ زیادہ صاف باتیں کیں، انھوں نے کہا۔ "تمھارا بھتیجا ہمارے معبودوں کو برا بھلا کہتا ہے۔ ہم کو احمق ٹھہراتا ہے اور ہمارے آدمیوں کو گمراہ کرتا ہے۔ اب تک ہم نے بہت ضبط کیا مگر اب بات حد سے تجاوز کر رہی ہے، اس لیے یا تو تم بیچ سے ہٹ جاؤ یا کھل کر میدان میں آجاؤ" تاکہ ہم میں سے ایک کا فیصلہ ہو جائے۔"

ابو طالب ایک تجربہ کار آدمی تھے۔ انھوں نے معاملہ کی نزاکت محسوس کرتے ہوئے رسول اللہ صلعم کو سمجھایا کہ "جانِ عم، میں بڈھا ہو چکا ہوں۔ میرے اوپر اتنا بوجھ نہ ڈالو کہ میں اٹھا نہ سکوں۔" آپ کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔ فرمایا "خدا کی قسم اگر یہ لوگ میرے ایک ہاتھ پر سورج اور دوسرے پر چاند لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنے فرض سے باز نہ آؤں گا۔ میرا بھروسہ خدا پر ہے جو یا تو اس کام کو پورا کرائے گا یا میں خود اس پر نثار ہو جاؤں گا۔"

دل سے نکلی ہوئی بات سیدھی ابو طالب کے دل میں اتر گئی، انھوں نے کہا "جب تک میرے دم میں دم ہے کوئی تمھارا بال بیکا نہیں کر سکتا۔"[1]

حضور سرورِ کائناتؐ مکہ کے گلی کوچوں میں گھوم پھر کر تبلیغ کرتے، بازاروں اور میلوں میں تشریف لیجاتے اور لوگوں کو دین کی باتیں سمجھاتے، ان کو جمادات اور نباتات سے منہ موڑ کر حقیقی معبود سے رشتہ جوڑنے کی نصیحت فرماتے، زنا سے روکتے، جوا کھیلنے سے منع کرتے، خوش خلقی، احسان اور عدل کا سبق سکھاتے۔ فرماتے کہ لوگوں کو چاہیے کہ اپنے جسموں کو نجاست سے، زبان کو گندی باتوں سے اور دلوں کو

---

[1] امام بخاری، کتاب التاریخ۔

جھوٹے عقیدوں اور کمینی خواہشوں سے محفوظ رکھیں۔"

آپ تبلیغ کے لئے نکلتے تو مخالفوں کی ٹولیاں ساتھ ہو جاتیں۔ جب آپ تقریر کرنے کھڑے ہوتے تو یہ آپ کا مذاق اڑاتے اور قہقہے لگاتے اور اتنا شور مچاتے کہ بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ ابولہب لوگوں سے کہتا۔ بھائیو! اسکی باتوں پر دھیان نہ دو، اس بیچارے کو جنون ہو گیا ہے۔" اور کوئی کہتا کہ محمدؐ شاعر ہو گئے ہیں اور یہ سب انکی شاعری ہے[۱]۔"

قریش کی مخالفت روز بروز بڑھتی گئی۔ وہ آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے، جسم مبارک پر نجاست ڈالتے، گالیاں دیتے اور اکیلے دکیلے مسلمانوں کو پا جاتے تو ان کو مارتے پیٹتے اور ذلیل کرتے۔ ایک روز آپ خانہ کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ عقبہ نے آپ کے گلے میں چادر لپیٹ کر اس زور سے کھینچی کہ آپ گھٹنوں کے بل گر پڑے، ابوجہل نے آپ کے سر پر پتھر کھینچ مارا۔ حرم کعبہ میں ایک دفعہ سجدہ میں گئے تو اس نے آپ کی پیٹھ پر اونٹ کی اوجھڑی رکھ دی۔

حضرت بلالؓ اُمیّہ بن خلف کے غلام تھے۔ اُمیّہ نے ان کے مسلمان ہونے کو سُنا تو آپے سے باہر ہو گیا اور ان کے گلے میں رسّی ڈال کر بازاری لڑکوں کے ہاتھ میں دی کہ ان کو پہاڑیوں پر گھسیٹتے پھریں، یہ سزا ختم ہوئی تو ان کو وادی مکہ کی گرم ریت پر لٹایا گیا اور تپتے ہوئے پتھر سینہ پر رکھے گئے۔ یہ عمل ہفتوں جاری رہا، بالآخر حضرت ابوبکرؓ نے انھیں خرید کر آزاد کیا[۲]۔

حضرت خبّاب بن الارت بھی ایک غلام تھے، وہ مسلمان ہوئے تو گھر والوں نے زمین پر انگارے بچھا کر ان کے اوپر انھیں لٹا دیا، ایک شخص سینہ پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ

---

[۱] ابن ہشام　　[۲] طبقات ابن سعد، جلد ۳

بدلنے پائیں، یہاں تک کہ انگارے بجھ گئے۔ حضرت خباب نے ایک عرصہ بعد یہ واقعہ حضرت عمرؓ سے بیان کیا اور پیٹھ کھول کر دکھائی تو وہ بالکل مبروصوں کی سی معلوم ہوتی تھی۔[۱]

حضرت ابو فکیہہ کے سینے پر اتنا بھاری پتھر رکھا گیا کہ ان کی زبان نکل پڑی۔[۲]

حضرت عثمانؓ صاحب حیثیت تھے، دوسرے نہ بول سکے تو خود ان کے چچا نے کھجور کے تنے سے باندھ کر ان کو خوب مارا۔[۳]

حضرت زبیر اسلام لائے تو ان کے چچا نے چٹائی میں لپیٹ کر ان کی ناک میں دھواں دیا۔[۴] سعید بن زید رسیوں میں جکڑ کر ڈال دیئے گئے[۵] اور مصعب بن عمیر کو ان کی والدہ نے گھر سے نکال دیا۔[۶]

یہ چند مثالیں ہیں ورنہ ایسے واقعات تو ہر روز ہوا کرتے تھے، مسلمان یہ سب سہتے تھے اور ثابت قدم رہتے تھے۔ ایک مسلمان بھی ان ہولناک مظالم سے ڈر کر ایمان کے راستہ سے نہ ہٹا، علامہ شبلی نے گاڈفری ہگنس (GODFERY HIGGINS) کی کتاب "اپالوجیہ" (APOLOGIA) سے ذیل کی عبارت ترجمہ کر کے نقل کی ہے۔[۷]

"عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمدؐ کی تعلیمات نے اس درجہ نشۂ دینی آپ کے پیرووں میں پیدا کیا جس کو عیسیٰؑ کے ابتدائی پیرووں میں تلاش کرنا بے فائدہ ہے۔ جب عیسیٰؑ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیرو بھاگ گئے۔ ان کا نشۂ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجہ میں گرفتار چھوڑ کر چل دیئے۔ .... برعکس اسکے محمدؐ کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد آئے اور آپ کے بچاؤ

---

[۱] اعجاز التنزیل صفحہ ۵۳ [۲] طبقات ابن سعد جلد ۳ [۳] تذکرہ صحابہ بدر [۴] تاریخ طبری [۵] صحیح بخاری [۶] اعجاز التنزیل [۷] سیرۃ النبی جلد ۱ صفحہ ۲۳۳

میں اپنی جانیں ڈال کر کل دشمنوں پر آپ کو غالب کیا۔"

قریش کی بے رحمیوں سے تنگ آکر حضرت خبابؓ نے ایک دن رسول اللہؐ سے عرض کیا کہ آخر آپ ان سفاکوں کے حق میں بد دعا کیوں نہیں فرماتے تو آپ کا چہرہ سرخ ہو گیا، ارشاد ہوا کہ "تم سے پہلے ایسے لوگ گزر چکے ہیں جن کے سر پر آرے چلائے گئے اور جن کے جسم چیر ڈالے گئے مگر وہ اپنے فرائض سے باز نہ آئے۔ خدا اس کام کو پورا کرائے گا۔"[1]

جبر و تعدی کے ساتھ قریش نے مصالحت اور مفاہمت کی بھی کوششیں جاری رکھیں، ان کو خیال ہوا کہ شاید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دولت و ثروت کی خواہش میں اپنی ایک علیحدہ جماعت بنانا چاہتے ہیں۔ اس بنا پر انھوں نے عتبہ بن ربیعہ کے ذریعے آپ کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر تم مکہ کی ریاست یا کسی بڑے گھرانے میں شادی یا دولت چاہتے ہو تو ہم اس پر راضی ہیں، ہمارے عقائد کی مخالفت چھوڑ دو" اور جب یہ تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی تو قوم کے سرداروں نے آپ کو خانۂ کعبہ میں گفتگو کے لئے مدعو کیا، آپ خوشی خوشی تشریف لے گئے، وہاں قریش نے کہا "محمد! تمھاری وجہ سے ہم جتنی پریشانی میں مبتلا ہو گئے ہیں کوئی قوم اپنے کسی فرد کی بدولت نہ ہوئی ہوگی، تم عذاب جان بن گئے ہو، اس سے قبل ہم نے جاہ و دولت کی پیش کش کی مگر وہ تمہیں منظور نہ ہوئی۔ تم کہتے ہو کہ تمھیں کوئی آسمانی چیز نظر آتی ہے جو تم کو ان نئی باتوں کی تعلیم دیتی ہے، یقیناً وہ کوئی جن یا بھوت پلیت ہے۔ کسی نے تم پر جادو یا ٹوٹکا کر دیا ہے ہم سے مفصل بیان کرو تاکہ تمھارے علاج کا انتظام کر دیا جائے۔ ہم خود کل مصارف برداشت کریں گے۔"

---

[1] صحیح بخاری

آنحضرت صلعم نے جواب دیا "تمھاری محبت کا شکریہ مگر جو کچھ تم نے کہا ہے اسکو میری حالت سے کوئی مناسبت نہیں ہے۔ جو تعلیم مجھے دی جاتی ہے وہ کسی جادو یا ٹوٹکے کے اثر سے نہیں ہے اور نہ کوئی جن ہی مجھ پر غالب آگیا ہے، میں خدا کے فضل سے بالکل تندرست ہوں، میری دعوت کے پیچھے کوئی دنیوی غرض بھی نہیں ہے، خدا نے مجھے تمھاری ہدایت کے لئے اپنا نبی بنا کر بھیجا ہے۔ مجھ پر اپنی کتاب اتاری ہے اور مجھے اپنا بشیر اور نذیر بنایا ہے۔ میرا کام تم تک اپنے رب کا کلام پہنچا دینا ہے۔ اب مانو یا نہ مانو تو یہ تمھارا فعل ہے۔ اگر مانو گے تو یہ تمھارے لئے دنیا و آخرت کا سرمایہ ہے اور اگر رد کروگے تو میں اللہ کے حکم کا انتظار کروں گا کہ وہ میرے اور تمھارے لئے کیا فیصلہ کرتا ہے۔"

قریش :۔ "اچھا اگر یہی ہے تو ایک بات سنو۔ تم جانتے ہو کہ ہمارے یہاں پانی کی کتنی کمی ہے، زمین بھی ہمارے پاس کم ہے، تم اپنے خدا سے دعا کرو کہ ان پہاڑوں کو یہاں سے ہٹا دے، تاکہ ہمارے شہر کا میدان کھل جائے اور یہاں ایسی نہریں جاری کردے جیسی کہ شام اور عراق میں ہیں، نیز ہمارے خاندان کے مردہ سرداروں کو دوبارہ زندہ کردے تاکہ ہم ان سے دریافت کرسکیں کہ خدا کے یہاں تمھارا کوئی رتبہ بھی ہے یا نہیں؟"

پیغمبر صلعم :۔ "میں ان باتوں کے لئے نہیں مبعوث ہوا ہوں، پیغمبروں کا کام ہدایت دینا ہوتا ہے۔"

قریش :۔ "اگر تم ہمارے لئے کچھ نہیں کرسکتے تو نہ سہی۔ خود اپنے لئے خدا سے سوال کرو کہ وہ ایک فرشتہ تم پر تعینات کردے جو تمھارے ساتھ رہا کرے اور تمھاری نبوت کی تصدیق کیا کرے۔"

پیغمبر صلعم: "میں خدا کے یہاں کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں۔"

قریش:۔ "تم کہتے ہو کہ تمھارا خدا قادر مطلق ہے اور ہمارے دیوی دیوتا جھوٹے ہیں، پھر تمھارا خدا ہم پر آسمان کا کوئی ٹکڑا کیوں نہیں گرا دیتا جو ہم اپنی آنکھوں سے اپنی مخالفت کا انجام دیکھ لیں۔"

پیغمبر صلعم:۔ خدا بیشک ہر چیز پر قادر ہے، وہ چاہے تو ایسا کر سکتا ہے۔ اب یہ اسکی خوشی ہے کہ کرے یا نہ کرے۔"

قریش: "کیا تمھارے خدا نے تم کو پہلے سے مطلع کر دیا تھا کہ ہم کیا کیا پوچھیں گے اور تم کیا کیا جواب دو گے۔ دیکھو آج ہم نے اپنے عذر صاف صاف بیان کر دیئے، اب ہم قسم کھاتے ہیں کہ اس نئی تعلیم کی اشاعت ہرگز نہ ہونے دینگے۔ یا تم کو ختم کر ڈالیں گے یا خود مٹ جائیں گے۔"

گفتگو یہیں تک پہنچی تھی کہ ایک شخص نے اٹھ کر کہا "ہم ملائکہ کی عبادت کرتے ہیں اور کریں گے جو خدا کی بیٹیاں ہیں۔" ایک دوسرے نے کہا "ہم کو تمھاری باتوں پر ذرا بھی اعتماد نہیں ہے، ہم صرف اس وقت قائل ہوں گے جب تمھارا خدا خود ہمارے سامنے آجائے گا۔" آنحضرت کا پھوپھی زاد بھائی بولا "دیکھو تمھاری قوم نے پہلے کچھ اپنے لئے سوال کئے، ان پر تم رضامند نہ ہوئے، آخر میں تم سے یہاں تک درخواست کی گئی کہ اس عذاب الٰہی کا تھوڑا سا نمونہ ہی دکھا دو جس سے تم ہر وقت ڈرایا کرتے ہو وہ بھی تمھیں منظور نہ ہوئی۔ اب میں تمھاری تقریر سننے کو مطلق تیار نہیں ہوں خواہ تم ہماری آنکھوں کے سامنے سیڑھی لگا کر آسمان پر ہی کیوں نہ چڑھ جاؤ یا فرشتے تمھاری رسالت کی گواہی کیوں نہ دیں[1]۔"

---

[1] قرآن مجید کی متعدد سورتوں مثلاً بنی اسرائیل، رعد، اعراف، انعام، عنکبوت میں اس مناظرہ کا تذکرہ موجود ہے۔ تفصیل کے لئے رحمۃ للعالمین جلد اوّل ملاحظہ ہو۔

قریش کی روک ٹوک اور ان کے طیش و غضب کے باوجود اسلام کا دائرہ پھیلتا گیا۔ ازد شنوءہ کے ضماد اور غفار کے ابو ذر جیسے سرداران قبیلہ اور امیر حمزہ اور عمر بن خطاب جیسے سرداران جلیل کا مشرف بہ اسلام ہونا ایک طرف مسلمانوں کی تقویت کا باعث ہوا تو دوسری طرف قریش کے قہر نے اور شدت اختیار کرلی۔

(۴)

یہ صورت دیکھ کر آنحضرت صلعم نے اجازت دیدی کہ صحابہ میں جن کا جی چاہے ترکِ وطن کرکے حبش چلے جائیں جہاں کے فرمانروا نجاشی کی شریف النفسی اور انصاف پروری کی بڑی شہرت تھی، چنانچہ ۵ھ نبوی میں گیارہ مرد اور چار عورتوں کا چھوٹا سا قافلہ چھپتا چھپاتا حبش پہنچ گیا۔ قریش کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے نجاشی اور اسکے ایک درباری کے لئے بیش بہا تحائف لے کر اسکے پاس سفارت بھیجی کہ ہمارے مجرم جو بھاگ کر آپ کے یہاں پناہ گزین ہو گئے ہیں ان کو ہمارے حوالہ کردیجئے۔ یہ سفرا نجاشی سے پہلے اس کے دربار کے پادریوں سے ملے اور ان کی خدمت میں تحفے پیش کئے اور کہا کہ ہمارے شہر کے چند نادانوں نے ایک نیا مذہب ایجاد کیا ہے۔ ہم نے ان کو روکا تو وہ آپ کے ملک میں بھاگ آئے ہیں۔ کل ہم بادشاہ کے دربار میں ان کے متعلق درخواست پیش کریں گے، آپ ہماری تائید فرمائیں۔ دوسرے روز سفراء دربار میں گئے اور نجاشی سے درخواست کی کہ مسلمان مہاجروں کو ان کے سپرد کردیا جائے۔ درباریوں نے بھی تائید کی، نجاشی نے مسلمانوں کو بلا بھیجا اور پوچھا "تم نے یہ کون سا دین ایجاد کیا ہے جو نصرانیت اور بت پرستی دونوں کے خلاف ہے؟"

مسلمانوں کی طرف سے حضرت علی رضؓ کے بھائی حضرت جعفر رضؓ نے جواب دیا

کہ "اے بادشاہ! ہم ایک جاہل قوم تھے، بت پوجتے تھے۔ نجاست میں گھرے ہوئے تھے، مردار کھاتے تھے، بدکاریاں کرتے تھے۔ پڑوسیوں کو ستاتے تھے، بھائی بھائی پر ظلم کرتا تھا، طاقتور کمزوروں کو کھا جاتے تھے، نہ کوئی قاعدہ تھا نہ قانون، ایسی حالت میں ایک شخص مبعوث ہوا۔ جس کی شرافت، سچائی اور دیانت داری سے ہم پہلے سے واقف تھے، اس نے ہم کو اسلام کی دعوت دی اور یہ سکھلایا کہ ہم پتھروں کو پوجنا چھوڑ دیں، سچ بولیں، خونریزی سے باز آئیں، یتیموں کا مال نہ کھائیں، ہمسایوں کے ساتھ اچھا سلوک کریں، گناہوں سے دور رہیں، برائیوں سے بچیں۔ نماز پڑھیں، روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں، ہم اس پر ایمان لائے، شرک اور بت پرستی چھوڑ دی اور تمام بُرے اعمال سے باز آئے۔ اس جرم میں ہماری قوم ہماری جان کی دشمن ہوگئی۔ اور ہم کو مجبور کرتی ہے کہ ہم اسی گمراہی میں واپس آجائیں، جہاں تک ہوسکا ہم نے اس کے مظالم برداشت کئے۔ جب مجبور ہوئے تو آپ کے ملک میں پناہ لینے چلے آئے ہیں"۔

نجاشی نے کہا "جو کلامِ الٰہی تمھارے پیغمبر پر اترا ہے کہیں سے پڑھو"۔
حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی چند آیتیں پڑھیں۔ بادشاہ پر ان کا ایسا اثر ہوا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔ اس نے کہا "خدا کی قسم! محمدؐ تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیحؑ نے دی تھی"۔ اس کے بعد اس نے سفرائے قریش سے کہا کہ "تم لوٹ جاؤ۔ میں ان مظلوموں کو ہرگز واپس نہ دوں گا۔

دوسرے روز عمرو بن العاص نے جو سفارت کے قائد منتخب ہوئے تھے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ "حضور، آپ کو معلوم ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ نجاشی نے یہ دریافت کرنے کو مسلمانوں

کو بلا بھیجا۔ ان لوگوں کو فکر ہوئی کہ اگر حضرت عیسیٰ کے ابن اللہ ہونے کا اقرار کرتے ہیں تو اپنے دین کی تعلیمات سے ہٹتے ہیں اور اگر انکار کرتے ہیں تو نجاشی عیسائی ہے، خفا ہو جائے گا۔ مگر حضرت جعفر نے کہا کہ کچھ بھی ہو ہم کو سچ بولنا چاہیئے۔"

غرض یہ لوگ دربار میں حاضر ہوئے۔ نجاشی نے پوچھا "تم حضرت عیسیٰ کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہو؟" حضرت جعفر نے جواب دیا کہ ہمارے پیغمبر نے بتایا ہے کہ عیسیٰؑ خدا کے بندے اور پیغمبر اور کلمۃ اللہ ہیں۔ نجاشی نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھا لیا اور اسے دکھا کر بولا "خدا کی قسم! جو تم نے کہا عیسیٰ اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔" نصرانی پادری جو دربار میں تھے وہ نہایت برہم ہوئے مگر نجاشی نے ان کی پرواہ نہ کی اور قریش کے سفیروں کو بالکل ناکام واپس آنا پڑا[1]۔

مشرکین مکہ نے جب یہ دیکھا کہ حبش تک جانے سے بھی کچھ حاصل نہ ہوا تو ان کا جذبۂ عداوت اور بڑھا اور انھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ آنحضرت صلعم کے سارے خاندان کو محصور کر کے تباہ کر دیا جائے، محرم ۷ ؁ نبوی میں تمام قبائل نے مل کر خاندان ہاشم کی مکمل ناکہ بندی کر دی اور ان سے رشتہ، ناطہ، کھانا پینا، بولنا چالنا، خرید و فروخت غرض ہر طرح کے تعلقات منقطع کر لئے، ابو طالب مجبور ہو کر اپنے خاندان سمیت مکہ کی ایک گھاٹی شعب ابی طالب میں پناہ گزیں ہو گئے، قریش نے غلہ وغیرہ بند کر دیا۔ ان لوگوں نے طلح کے پتے کھا کھا کر بسر کی۔ حضرت سعد کا بیان ہے، کہ "ان دنوں ایک بار سوکھا چمڑا ہاتھ آ گیا تھا، میں نے اسے دھو کر آگ پر بھونا اور پانی میں ملا کر کھایا۔" نبی صلعم کے عزم میں اس پر بھی کمی نہ آئی۔ حج کے ایام میں (قریش اس مہینہ میں لڑنا حرام سمجھتے تھے) جب مکہ میں باہر کے لوگ آتے تو آپ گھاٹی سے

---

[1] زاد المعاد ج ۱ ص ۲۴ مستدرک حاکم ج ۲ ص ۳۱۰

نکل کر تبلیغ فرمایا کرتے۔

تین سال تک بنو ہاشم نے اس حصار میں بسر کی، آخر صبر و استقلال نے فتح پائی اور دشمنوں ہی کو ترس آیا۔ ہشام عامری جو خاندان ہاشم کا قریبی رشتہ دار تھا اور ان کو چوری چھپے کھانے کا سامان بھیجتا رہتا تھا، زہیر کے پاس، جو عبدالمطلب کے نواسے تھے، گیا اور کہا "کیوں زہیر تم کو یہ پسند ہے کہ تم کھاؤ پیو اور ہر قسم کا لطف اٹھاؤ اور تمھارے ماموں کو ایک دانہ تک نصیب نہ ہو" بالآخر قریش کے چند سردار ہتھیار باندھ کر بنی ہاشم کے پاس گئے اور ان کو درّہ سے نکال لائے[1]

مکہ والوں سے مایوس ہو کر آپ نے شہر سے نکل کر تبلیغ کرنے کا ارادہ کیا اور پیادہ پا طائف تشریف لے گئے۔ وہاں ظالموں نے آپ کے پاؤں پر اتنے پتھر مارے کہ خون جوتوں میں جم گیا۔ زخموں سے چور ہو کر جب آپ بیٹھ جاتے تو وہ ہاتھ پکڑ کر کھڑا کر دیتے اور پھر پتھراؤ کرتے، عاجز آکر آپ نے ایک مکان کے احاطہ میں پناہ لی، بدمعاشوں کا مجمع وہاں بھی پہنچ گیا اور آپ کو اتنا مارا کہ بیہوش ہو کر گر پڑے، حضرت زید ساتھ تھے، انھوں نے آپ کو پیٹھ پر اٹھایا اور آبادی کے باہر لے گئے، وہاں آپ کو ہوش آیا۔ یہ سب برداشت کرنے کے بعد بھی آپ کو اپنے مقصد میں مطلق کامیابی نہیں ہوئی تھی اور طائف میں ایک شخص بھی مسلمان نہیں ہوا تھا۔ آپ کا دل بھر آیا اور ہاتھ اٹھا کر آپ نے بارگاہ ایزدی میں عرض کیا کہ:۔

"اے اللہ اپنی ناتوانی اور بے بسی اور لوگوں کے ہاتھوں جو میری تحقیر ہوئی ہے اس کی میں تجھ سے فریاد کرتا ہوں، تو سب رحم کرنے والوں سے زیادہ رحم

[1] طبقات ابن سعد و سیرۃ النبی جلد اوّل

کرنے والا ہے۔ درماندوں اور عاجزوں کا مالک ہے، میرا مالک تو ہی ہے

تو مجھے کس کے سپرد کرتا ہے؟ بیگانہ اور ترشرو کے سپرد؟ یا اس دشمن کے سپرد جو

بہت با اختیار ہے؟ لیکن اگر تو مجھ سے خفا نہیں ہے تو مجھے کسی بات کا ڈر نہیں

ہے، اگرچہ تیری عافیت میرے لئے زیادہ کشادہ ہے۔ میں اس بات سے کہ تیرا

غضب یا تیری نا رضامندی مجھ پر نازل ہو تیری ذات کے نور کی پناہ چاہتا ہوں

جس سے تمام تاریکیاں روشن ہو جاتی ہیں اور دنیا و آخرت کے سبھی کام بن جاتے

ہیں۔ مجھے صرف تیری خوشنودی اور تیری رضامندی درکار ہے۔ تو ہی میرا

سہارا ہے اور تیرا ہی مجھے خوف ہے[۱]"

اور حضرت زید سے آپ نے فرمایا "میں اہل طائف کی بربادی کے لئے کیوں دعا کروں'

اگر یہ ایمان نہیں لاتے تو کیا ہوا۔ ان کی آئندہ نسلیں انشاءاللہ خدائے واحد کی عبادت

کرنے والی ہوں گی[۲]"

یہ تو آنحضرت صلعم کا معمول تھا ہی کہ حج کے زمانہ میں جو قبیلے مکہ آتے تھے، آپ ان کے

پاس جا کر دین کی دعوت دیتے تھے۔ سنہ ۱۰ نبوی میں مدینہ سے آئے ہوئے کچھ اشخاص اسلام

میں داخل ہوئے اور اس طرح اس مبارک شہر میں اسلام کی کرنیں پھیلنا شروع ہوئیں۔

یہ لوگ اپنے یہاں کے یہودیوں سے سنتے آئے تھے کہ ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے'

اسلئے انھوں نے نبی صلعم کی باتیں سنتے ہی یہ کہہ کر ایک ساتھ بیعت کر لی کہ "جلدی کرو۔

کہیں یہودی ہم پر سبقت نہ لے جائیں"۔ دوسرے سال مدینہ منورہ کے بارہ اشخاص

نے بیعت کی، بیعت کی شرطیں یہ تھیں[۱]:۔

(۱) ہم تنہا ایک خدا کی عبادت کریں گے اور کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرائیں گے

---

[۱] طبری [۲] صحیح مسلم بروایت حضرت عائشہ

(۲) ہم چوری اور زنا نہ کرینگے۔

(۳) ہم اپنی اولاد (یعنی لڑکیوں) کو قتل نہ کرینگے۔

(۴) ہم کسی پر جھوٹی تہمت نہ لگائیں گے، نہ چغلی کھائیں گے۔

(۵) ہر اچھی بات میں نبی کی اطاعت کریں گے۔

لوٹتے وقت آنحضرت صلعم نے ان کی تعلیم کے لئے مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ کردیا۔ یہ ایک نہایت دولتمند گھرانے کے فرزند تھے، گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتے تو آگے پیچھے غلام چلتے تھے، دو سو روپیہ سے کم قیمت کی پوشاک نہیں پہنتے تھے، مگر داخلِ اسلام ہونے کے بعد ان کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ بدن پر صرف ایک کمبل ہوتا تھا جسے کانٹوں سے اٹکالیا کرتے تھے۔

(۵)

نبوت کے تیرھویں سال اللہ تعالیٰ نے آپ کو مَلکُوتُ السموات والارض کی سیر کرائی، یہ بحث اکثر سننے میں آتی ہے کہ معراج جسمانی تھی یا روحانی، بیداری کی چیز تھی یا خواب کی، جمہور کا مذہب یہی ہے کہ جسمانی تھی اور بیداری کی حالت میں واقع ہوئی تھی۔

ہم کو اس سلسلہ میں ابن اسحاق کی یہ بات بہت پسند آئی کہ خدا قادر مطلق ہے وہ اپنے بندہ کو رات کے وقت لے گیا، جس طرح چاہا اور جیسے چاہا تاکہ وہ اسکے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو چاہے دکھائے، یہاں تک کہ آپ نے خدا کی شان اور اسکی قدرت کے عظیم الشان مناظر دیکھے جو کچھ دیکھے اور اس قدرت کو دیکھا جس سے وہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے[۱]۔

سیرۃ بن ہشام باب الاسرا۔ سیرۃ النبی

اسی مافوق الفہم سفر کے موقع پر کائنات کے محافظ نے آپ کو ہجرت کی دعا کا الہام کیا یا حکم دیا۔ اگلے سال مدینہ کے بہتر آدمیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی، اس موقع پر آپ نے ان سے چند سوالات بھی کئے۔

آپ نے پوچھا:۔ کیا تم اشاعت دین میں میری مدد کرو گے اور اگر میں تمہارے شہر میں آبسوں تو تم میرے اور میرے ساتھیوں کے ساتھ اپنے ہی لوگوں جیسا برتاؤ کرو گے؟"

جواب میں مدینہ والوں نے دریافت کیا کہ اسکے معاوضہ میں انھیں کیا ملے گا؟

آپ نے فرمایا" خدا کی خوشنودی۔"

ان لوگوں نے عرض کیا" یا رسول اللہؐ ایسا تو نہ ہوگا کہ جب قوت و اقتدار حاصل ہو جائے تو آپ ہم کو چھوڑ کر اپنے وطن چلے آئیں؟"

آپ نے مسکرا کر فرمایا" نہیں تمہارا خون میرا خون ہے۔ میرا جینا اور مرنا تمہارے ساتھ ہوگا۔"

آپ کے چچا حضرت عباسؓ جو اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے، آپ کے ساتھ تھے۔ انھوں نے انصار سے کہا محمدؐ اپنے خاندان میں معزز اور محترم ہیں۔ دشمنوں کے مقابلہ میں ہم ہمیشہ ان کے لئے سینہ سپر رہے۔ اب وہ تمہارے پاس جانا چاہتے ہیں۔ اگر مرتے دم تک ساتھ دے سکو تو ٹھیک ہے ورنہ ابھی جواب دیدو۔"

انصار نے وعدہ کرلیا اور جوش میں آکر کہا" ہم لوگ تلواروں کی گود میں پلے ہیں۔"

یہ سارا واقعہ قریش کا ایک شخص ایک ٹیلہ کی آڑ سے دیکھ رہا تھا۔ اس نے چیخ کر اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کہا" بھائیو! ہمارے خلاف جنگ کے مشورے ہو رہے ہیں۔"

اس پر انصار کو طیش آگیا اور انھوں نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا۔ "اگر رسول اللہؐ اجازت دیں تو ہم ابھی ان کو اپنی تلواروں کے جوہر دکھادیں۔" لیکن آپ نے اجازت نہ دی۔ آپ نے فرمایا۔ "مجھے جنگ کا حکم نہیں ہے۔ اسکی باتوں کی پرواہ نہ کرو۔"[1]

اسکے بعد نبی صلعم نے صحابہ کو مکّہ سے ہجرت کر جانے کی اجازت دیدی۔ قریش نے روک ٹوک تو بہت کی، مگر چوری چھپے رفتہ رفتہ اکثر صحابہ مدینہ چلے گئے۔ اکابر میں صرف حضور سرورِ کائنات، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت علی مرتضیٰؓ رہ گئے۔ قریش نے سوچا کہ یہ آپ کو قتل کرنے کا بہترین موقع ہے اور اس پر غور کرنے کے لئے دارالندوہ میں جو ان کا دارالشوریٰ تھا خفیہ اجلاس کیا۔ تمام قبیلوں کے سرداروں نے اس میں شرکت کی اور مختلف رائیں پیش کیں۔ ایک نے کہا "محمدؐ کے گلے میں طوق اور زنجیر ڈال کر کسی مکان میں قید کردو تاکہ سسک سسک کر مر جائے۔" دوسرا بولا "یہ مناسب نہ ہوگا۔ محمدؐ کے قید کی خبر چھپ نہ سکے گی۔ سنتے ہی مدینہ والے آکر اسے چھڑا لیجائینگے۔" ایک اور شخص نے یہ تجویز پیش کی کہ "محمدؐ کو کسی سرکش اونٹ پر بیٹھا کر یہاں سے نکال دو۔ کہیں اور جاکر جیئے یا مرے، ہماری تو جان چھوٹے۔" اس پر اپنے کو نجدی ظاہر کرنے والے ایک بڈھے شخص نے اعتراض کیا کہ "معلوم ہوتا ہے تم محمدؐ کی دل آویز باتوں کو بھول گئے ہو، وہ چند جملے بول کر جسے چاہتا ہے اپنا بنا لیتا ہے، وہ جہاں بھی جائے گا اپنے ہمدرد پیدا کرلے گا اور پھر تم سے بدلے لے گا۔" آخر میں ابوجہل کی یہ تجویز سب کو پسند آئی کہ ہر قبیلہ سے ایک شخص منتخب کیا جائے اور یہ سب مل کر ایک ساتھ محمدؐ پر حملہ کردیں۔ اس طرح اس کا خون تمام خاندانوں اور قبیلوں میں بٹ جائے گا اور مسلمان ہمارے کل خاندانوں اور

---

[1] طبقات ابن سعد

قبیلوں سے بدلہ لینے کی ہمت نہ کرسکیں گے۔"[1]

چنانچہ رات میں ان لوگوں نے آنحضرت صلعم کا مکان گھیر لیا۔ عرب زمانہ جاہلیت میں بھی دوسرے کے گھروں کے زنانہ حصوں میں گھسنا معیوب سمجھتے تھے، اس لئے وہ باہر ٹھہرے رہے کہ صبح جب آپ برآمد ہوں گے تو حملہ کیا جائے گا۔

آنحضرت صلعم کی امانت کا اتنا شہرہ تھا کہ مخالفت اور مخاصمت کے باوجود اکثر اہل مکّہ آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ جب آپ کو خطرہ کا احساس ہوا تو آپ نے یہ سب امانتیں نام بنام حضرت علیؓ کے سپرد کیں کہ صبح جاکر انھیں واپس کر آنا، پھر سورۂ یٰسین پڑھتے ہوئے مکان سے باہر تشریف لائے اور رات کے سایہ میں قریش کے حصار سے نکل گئے اور مدینہ روانہ ہو گئے صبح ہونے پر قریش کو خبر ہوئی تو انھوں نے دور دور تک خاک چھان ماری مگر آپ کو نہ پا سکے۔

اکثر مغربی مصنفوں نے ہجرت کے لئے FLIGHT (بمعنی فرار) کا لفظ استعمال کیا ہے جس سے آپ کے میدان چھوڑ کر بھاگ نکلنے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ یہ قطعی غلط ہے، مکّہ سے وقتی طور پر مسلمانوں کا ہٹ جانا ایک دفاعی اقدام تھا تاکہ مدینہ میں اپنا ایک مرکز بنا سکیں جہاں نہ قریش کی عظمت و اقتدار سے ٹکراؤ ہوتا تھا اور نہ خاندانی رقابتیں دین کی راہ میں رخنے ڈالتی تھیں۔ مشہور عالم عیسائی مؤرّخ ہٹّی نے لکھا ہے کہ ہجرت کا منصوبہ محض مکّہ سے بھاگ جانے کے لئے نہیں تھا بلکہ دو برس کے مسلسل غور و خوض کا نتیجہ تھا۔ میجر جنرل اکبر خاں کے نزدیک بھی ہجرت دفاعی سیاست کا ایک نادر نمونہ تھی۔[2]

---

[1] صحیح بخاری، باب الہجرت [2] حدیث دفاع، ص ۱۱۷-۹۷

تیسرا مقالہ

حیاتِ طیبہؐ (۲)

ہجرت کے بعد

اِنَّا فَتَحۡنَا لَكَ فَتۡحًا مُّبِيۡنًا

(ہم نے تم کو کھلی ہوئی فتح عنایت کی۔ القرآن، فتح)

مدینہ والوں نے جب سے سنا تھا کہ رسول اللہ صلعم نے مکہ چھوڑ دیا ہے، وہ دیدہ و دل فرشِ راہ کئے ہوئے تھے۔ سارا شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا۔ لوگ صبح ہوتے ہی شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کرتے رہتے۔ ایک روز وہ انتظار کر کے واپس ہی ہوئے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر اس نے زور سے پکار کر کہا "اہل عرب لو، تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا"۔ یہ سنتے ہی لوگ اللہ اکبر کے نعرے لگاتے ہوئے دوڑ پڑے اور آپ کے گرد جمع ہو گئے۔

مدینۂ منوّرہ سے کوئی تین میل کے فاصلہ پر قبا آباد ہے، یہاں انصار کے جو خاندان رہتے تھے ان میں سب سے زیادہ ممتاز عمرو بن عوف کا خاندان تھا، آنحضرت صلعم یہاں

پہنچے تو سارا خاندان خوشی کے مارے تکبیر کے نعرے لگانے لگا۔ آپ نے اسی کی مہمانی قبول فرمائی۔ جو صحابہ پہلے مدینہ آچکے تھے ان میں سے بھی اکثر یہیں قیام پذیر تھے۔ حضرت علیؓ آنحضرت صلعم کے روانہ ہونے کے تین روز بعد مکہ سے چلے تھے۔ وہ بھی پیادہ پا سفر کرتے ہوئے پہنچ گئے اور یہیں ٹھہرے۔

قبا میں آپ کا پہلا کام مسجد کا تعمیر کرانا تھا۔ مسجد کی تعمیر میں دوسرے صحابہ کے ساتھ آپ نے ایک ادنیٰ مزدور کی طرح شرکت فرمائی۔ اپنے ہاتھ سے بھاری بھاری پتھر اٹھا کر لاتے۔ ان کے وزن سے اکثر جسم مبارک خم ہو جاتا۔ عقیدت مند آتے اور عرض کرتے "ہمارے ماں باپ آپ پر قربان آپ چھوڑ دیں، ہم اٹھا لیں گے۔" آپ ان کی درخواست قبول فرما لیتے، لیکن فوراً ہی دوسرا پتھر اسی وزن کا اٹھا لیتے۔

چند روز قیام فرمانے کے بعد آپ جمعہ کو شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ بنی سالم کے گھروں تک پہنچے تھے کہ نماز جمعہ کا وقت آگیا۔ جمعہ کی نماز یہیں ادا فرمائی۔ نماز سے پہلے خطبہ دیا۔ یہ اسلام میں سب سے پہلی نماز جمعہ اور رسول اللہ صلعم کا سب سے پہلا خطبۂ نماز تھا۔۔۔ خطبہ کے چند ٹکڑے ملاحظہ ہوں۔

"حمد و ستائش خدا کے لئے ہے۔ میں اسی کی حمد کرتا ہوں (اور) مدد کیلئے ہدایت اور معافی اسی سے چاہتا ہوں، میرا ایمان اسی پر ہے۔ میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا اور نافرمانی کرنے والوں سے عداوت رکھتا ہوں، میری شہادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ یکتا ہے۔ کوئی اس کا شریک نہیں ہے (اور) محمدؐ اس کا بندہ اور رسول ہے۔۔۔۔"

"۔۔۔۔ جو کوئی خدا کی اطاعت کرتا ہے وہی کامیاب ہے، اور جس نے اس کا

حکم نہ مانا وہ راستہ سے بھٹک گیا۔ درجہ سے گر گیا۔۔۔

"۔۔۔۔ لوگو! جن باتوں سے خدا نے تم کو منع کیا ہے ان سے بچتے رہو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے، اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر۔۔۔

"۔۔۔۔ مسلمانو! اپنے موجودہ اور آئندہ اور ظاہر اور باطن میں تقویٰ کو پیش نظر رکھو، کیوں کہ جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں ان کی برائیاں گھٹا دی جاتی ہیں اور اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔ تقویٰ والے ہی وہ ہیں جو بہت بڑی مراد کو پہنچیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی ناخوشی، غصہ اور عذاب کو دور کر دیتا ہے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو درخشندہ، پروردگار کو خوش اور رتبہ کو بلند کرتا ہے۔۔۔۔"

"۔۔۔ مسلمانو! حظ اٹھاؤ، مگر حقوقِ الٰہی میں فروگزاشت نہ کرو، خدا نے اسی لئے تم کو اپنی کتاب سکھائی ہے اور اپنا راستہ دکھایا ہے کہ سچوں اور اور جھوٹوں کو الگ کر دیا جائے۔۔۔۔"[1]

شہر میں داخلہ کا عجیب و غریب منظر تھا۔ اطلاع ملتے ہی لوگ ہر طرف سے بیتابانہ ۔۔۔۔ پیش قدمی کے لئے دوڑے۔ آپ کے ننھیالی رشتہ دار بنو نجار ہتھیار سج کر آئے۔ آناً فاناً دو رویہ جاں نثاروں کی صفیں آراستہ ہو گئیں۔ راستہ میں انصار کے خاندان ملتے تھے۔ ہر قبیلہ کا سردار سامنے آکر عرض کرتا کہ "حضور، یہ گھر ہے، یہ مال ہے، یہ جان ہے۔" آپ معذرت کرتے، شکریہ ادا فرماتے اور دعائے خیر دیتے، شہر قریب آگیا تو جوش کا یہ عالم ہوا کہ شریف گھرانوں کی عورتیں چھتوں پر نکل آئیں اور خوشی کے گیت گانے لگیں۔

جہاں اب مسجد نبوی ہے اسی کے قریب حضرت ابوالیوب انصاری کا گھر تھا۔ کوکبۂ نبوی یہاں پہنچا تو آپ کو مہمان ٹھہرانے کا اصرار اتنا شدید ہوا کہ بالآخر قرعہ ڈالا گیا اور یہ سعادت ابوالیوب کے مقدر میں آئی۔

حضرت ابوایّوب کا مکان دو منزلہ تھا۔ انھوں نے اوپر کی منزل پیش کی مگر آپ نے ملاقاتیوں کی آسانی کے خیال سے نیچے کا حصّہ پسند کیا۔ ابوایّوب دونوں وقت آپ کی خدمت میں کھانا بھیجتے۔ آپ جو چھوڑ دیتے وہ ابوایّوب اور انکی بیوی کے حصّہ میں آتا۔ اللہ کے ان خوش نصیب بندوں کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ایک روز اتفاق سے بالائی منزل میں پانی کا برتن ٹوٹ گیا۔ خیال ہوا کہ کہیں پانی بہہ کر نیچے نہ جائے جو رسول اللہ صلعم کو تکلیف دہ ہو، گھر میں اوڑھنے کا لحاف تھا حضرت ابوایوب نے اسکو پانی پر ڈال دیا کہ جذب کرلے[۱]

یہاں بھی سب سے پہلا کام خانۂ خدا کی تعمیر تھی۔ حضرت ابوایّوب کے مکان کے قریب خاندان نجار کی زمین تھی، آپ نے ان کو بلوا کر فرمایا کہ میں یہ زمین بہ قیمت لینا چاہتا ہوں۔" ان لوگوں نے جواب دیا کہ ہم لوگ قیمت تو لیں گے، مگر آپ سے نہیں خدا سے۔" زمین کے اصل مالک دو یتیم بچے تھے۔ آپ نے ان سے دریافت کیا تو انھوں نے بھی ہدیہ کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن آپ نے گوارا نہ کیا۔ حضرت ابوایّوب نے قیمت ادا کی اور مسجد کی تعمیر شروع ہوئی، اللہ کا رسول پھر مزدوروں کی صف میں تھا صحابۂ کرام پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے اور رجز پڑھتے جاتے۔ آپ بھی ان کے ساتھ آواز ملاتے اور فرماتے[۲]

---

[۱] سیرۃ النبی ج ۱، ص ۲۷۹ [۲] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۲۸۱

اَللّٰھُمَّ لَا خَیْرَ اِلَّا خَیْرُ الْاٰخِرَۃ ۔ اے خدا! کامیابی صرف آخرت کی

فَاغْفِرِ الْاَنْصَارَ وَالْمُھَاجِرَۃ ۔ کامیابی ہے۔ اے خدا مہاجرین اور انصار کو بخش دے۔

یہ مسجد آرائش اور تکلف کی تمام باتوں سے یکسر پاک تھی، کچی اینٹوں کی دیواریں کھجور کے پتوں کی چھت اور کھجور ہی کے ستون۔ فرش بالکل کچا تھا۔ پانی برستا تو کیچڑ ہو جاتا تھا، ایک دن صحابہ نماز پڑھنے آئے تو کنکریاں لیتے آئے اور اپنی اپنی جگہ پر بچھا لیں، آنحضرت صلعم کو یہ صورت پسند آئی اور آپ نے سنگریزوں کا فرش بنوا دیا

مسجد سے متصل ہی آپ نے ازواج مطہرات کے لئے مکان بنوائے۔ یہ مکان چھ چھ سات سات ہاتھ چوڑے اور دس دس ہاتھ لانبے تھے۔ چھتیں اتنی نیچی تھیں کہ آدمی کھڑا ہو کر ان کو چھو لیتا تھا۔ دروازوں پر کمبل کا پردہ پڑا رہتا تھا چراغ کبھی نہ جلتا تھا۔[1]

(۲)

مسلمانوں میں ایک تو زیادہ مفلس و نادار تھے، دوسرے جو ان میں خوشحال بھی تھے وہ مشرکین مکہ سے چھپ کر آنے کی وجہ سے اپنا مال و اسباب ساتھ نہ لا سکے تھے۔ ان کے لئے مستقل انتظام کی ضرورت تھی، اگرچہ انصار نے کمال فراخدلی سے اپنے دروازے ان کے لئے کھول دیئے تھے مگر وہ ان کے دسترخوانوں سے منسلک رہنا پسند نہیں کرتے تھے، مہاجر محنت و مشقت کے عادی، جفاکش اور خوددار تھے، وہ اپنا روزگار شروع کرنا چاہتے تھے، مگر اسکے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، چنانچہ آنحضرت صلعم نے خیال فرمایا کہ مہاجرین و انصار میں بھائی چارہ کا رشتہ قائم کر دیا جائے۔ مسجد نبوی کی تعمیر کے بعد آپ نے ان دونوں کی ایک مشترکہ مجلس طلب کی، مہاجروں کی تعداد

---

[1] سیرۃ النبی ص ۲۸۲

اس وقت پینتالیس تھی، ان کی طرف سے آپ نے انصار کو مخاطب کر کے کہا کہ "یہ تمھارے بھائی ہیں" اور پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو افراد بلا کر فرمانے لگے "یہ اور تم بھائی بھائی ہو۔"

انصار گویا اسی حکم کے منتظر تھے انھوں نے مہاجروں کو ساتھ لیجا کر گھر کی ایک ایک چیز دکھادی کہ آدھی آپ کی ہے اور آدھی ہماری۔ حتیٰ کہ سعد بن ربیع جو عبدالرحمٰن بن عوف کے بھائی قرار پائے تھے، ان کی دو بیویاں تھیں۔ انھوں نے عبدالرحمٰن سے کہا، "ایک کو میں طلاق دئیے دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیجیے۔" لیکن وہ اس پر راضی نہ ہوئے۔

مدینہ والوں کا ذریعۂ معاش کھیتی باڑی تھا۔ وہاں سرمایہ کے اعتبار سے کھیت ہی سب کچھ سمجھے جاتے تھے۔ انصار نے درخواست کی کہ ان کھیتوں کے نصف حصے ان کے مہاجر بھائیوں کو دیدیئے جائیں۔ لیکن چونکہ مکّہ معظمہ میں زمین کی خرابی اور پانی کی کمی کی وجہ سے کاشتکاری کا رواج نہیں تھا اور وہاں کے لوگ صرف تجارت اور گلّے بانی کے پیشوں ہی سے واقف تھے، اس لئے مہاجروں نے معذوری ظاہر کی، اس پر انصار نے کہا کہ اگر ہمارے بھائی کاشتکاری کرنا نہیں جانتے ہیں تو ہم خود کل کام کر کے پیداوار کا آدھا حصّہ ان کو دیدیا کریں گے۔

یہ بھائی بندی کا رشتہ اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ جب کوئی انصاری مرتا تو اس کے ترکہ میں بھی مہاجرین حصّہ پاتے تھے۔ جنگ بدر تک یہی دستور رہا۔ اسکے بعد جب مہاجرین کو مدد کی حاجت نہ رہی تو اسے ختم کر دیا گیا۔

یہ تو انصار کی بے مثال مہمان نوازی اور سیر چشمی کی ایک دھندلی اور نامکمل

سی تصویر تھی۔ اب تھوڑا سا تذکرہ مہاجرین کی عالی ظرفی کا بھی ضروری ہے

سعد بن ربیع نے جب حضرت عبدالرحمٰن کو زر، زمین، زن، ہر چیز کے نصف کی پیش کش کی تو انھوں نے احسان مندی سے عرض کر دیا کہ آپ کا مال و متاع آپ کو مبارک، مجھے بازار کا راستہ بتا دیجئے"۔ بازار میں انھوں نے کچھ گھی اور پنیر خریدا اور اسے بیچنے لگے۔ چند دنوں میں ان کا کاروبار چل نکلا اور ان کی حالت اتنی سدھر گئی کہ انھوں نے شادی کر لی۔ بعض صحابہ نے دوکانیں کھول لیں، حضرت ابوبکر نے کپڑے کا کارخانہ قائم کیا، حضرت عثمان نے کھجوروں کی خرید و فروخت کرنا شروع کر دی۔ حضرت عمر نے ایک منڈی سے دوسری منڈی سامان پہنچانے کا کاروبار کر لیا۔

مدینہ میں مختلف مذاہب کے قبیلے آباد تھے۔ ان میں یہودی سب سے زیادہ طاقتور تھے۔ آنحضرت صلعم نے ہجرت کے پہلے ہی سال میں ان سے ایک معاہدہ کے ذریعہ تعلقات منضبط کر لیے۔ اس معاہدہ کی خاص خاص دفعیں یہ تھیں[۱]۔

(۱) سب لوگ ایک ہی قوم کے فرد سمجھے جائیں گے۔ یہودی مسلمانوں کے ساتھ ایک قوم ہیں۔

(۲) اگر معاہدہ کرنے والے کسی قبیلہ پر کوئی دشمن حملہ آور ہوگا تو تمام قبیلے مل کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

(۳) شریک معاہدہ قبیلوں کے تعلقات خیر خواہی، نفع رسانی اور نیک اطواری پر مبنی ہوں گے نہ کہ جبر پر؛ اور خلافِ اخلاق امور میں کوئی اعانت نہیں کیجائیگی۔

(۴) کوئی فریق قریش کو امان نہ دے گا۔

(۵) یہودیوں اور مسلمانوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔

(۶) مظلوم کی ہر حال میں مدد کی جائے گی۔

(۷) مدینہ کے اندر کشت و خون حرام ہوگا۔

(۸) معاہدہ کرنے والوں کے درمیان جھگڑے یا فساد کا اندیشہ پیدا ہونے کی صورت میں اس کا فیصلہ خدا اور اسکے رسول پر چھوڑ دیا جائے گا

مدینہ منورہ میں مسلمان مشکل سے دم لینے پائے تھے کہ قریش مکہ نے کہلا بھیجا کہ "تم مکہ سے بچکر نکل آنے پر زیادہ خوش نہ ہو۔ ہم خود مدینہ آکر تمھارا خاتمہ کئے دیتے ہیں"[1]

اس کے بعد انھوں نے انصار کو دھمکی دی کہ "تم نے ہمارے آدمی (رسول اللہ صلعم) کو پناہ دی ہے۔ یا تو اسے قتل کر ڈالو یا مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم قسم کھاتے ہیں کہ ہم سب مل کر تم پر حملہ کر دیں گے اور تم کو قتل کر کے تمھاری عورتوں پر قبضہ کر لیں گے"[2]

جب یہ داؤں نہ چلا تو قریش نے مدینہ کے یہودیوں سے سازباز کی اور مکہ سے مدینہ تک جو قبائل پھیلے تھے ان کو بھی مسلمانوں کے خلاف ابھارنا چاہا۔

اس آخری شرارت سے مدینہ والے بہت مضطرب ہوئے، کیونکہ قبائلیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی اور وہ نہایت غیر متمدن، تندخو اور جنگجو تھے۔ وہ جب چاہتے متحد ہو کر مدینہ کا امن غارت کر سکتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اطلاع پاتے ہی ان کے پاس سفارتیں روانہ کیں، کچھ کے پاس خود تشریف لے گئے اور ان میں سے اکثر کے ساتھ دوستی کے معاہدے کر لئے۔

قریش کی زیادتیاں برابر بڑھتی گئیں اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ ان کے ایک رئیس نے مدینہ کی چراگاہ پر حملہ کر کے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مویشی لوٹ لئے۔ مسلمان اسے مکہ والوں کے باقاعدہ حملہ کا پیش خیمہ سمجھ کر اپنی حفاظت کی تیاریاں کرنے لگے۔ قریش کے تجارتی تعلقات

---

[1] سنن ابی داؤد، جلد ۲ [2] ایضاً

زیادہ تر شام سے تھے اور شام کا راستہ مدینہ کے پاس سے ہو کر گزرتا تھا۔ اس لئے مسلمانوں نے سوچا کہ اگر قریش کے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت بند کر دی جائے تو وہ مجبور ہو کر صلح کر لیں گے۔ تجارت ہی پر مکہ والوں کی روزی کا انحصار تھا۔ رات کو شہر میں پہرے کا بھی انتظام کیا گیا، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جاگ جاگ کر راتیں بسر کیں اور یہ بھی طے پایا کہ قریش کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھی جائے جس میں وہ اچانک حملہ نہ کرنے پائیں، مکہ کی طرف سو سو پچاس پچاس ٹکڑیاں روانہ کی جانے لگیں۔

اس سلسلہ میں آنحضرت صلعم نے عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ بطن نخلہ کی طرف جو مکہ اور طائف کے درمیان کوئی پندرہ میل پر واقع ہے بھیجا کہ "نخلہ میں قیام کرو اور قریش کے حالات کا پتہ لگا کر انھیں اطلاع دو۔" انھوں نے قریش کے ایک تجارتی قافلہ پر جو شام سے لوٹ رہا تھا حملہ کر دیا۔ قافلہ کا ایک شخص مارا گیا، دو گرفتار ہوئے اور بہت سا مال غنیمت ہاتھ لگا۔ حضرت عبداللہ نے مدینہ آکر واقعہ بیان کیا تو آنحضرت صلعم کو سخت ناگوار ہوا اور آپ نے مالِ غنیمت کی چیزیں لینے سے انکار کر دیا۔ صحابہ کرام نے بھی حضرت عبداللہ پر غصّہ کیا۔[۵]

اس جھڑپ کی خبر آگ کی طرح مکہ پہنچی۔ قریش انتقام کے جنون میں انگاروں پر لوٹنے لگے۔ مدینہ پر چڑھائی کرنے کے لئے لشکر آراستہ ہونے لگا۔ اس سے نبی صلعم بہت متفکر ہوئے۔ آپ نے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مہاجرین نے پرجوش تقریریں کیں۔ جاں نثاری کا یقین دلایا لیکن آپ برابر انصار کی طرف دیکھتے رہے۔ وہ آپ کی بات سمجھ گئے۔ ان کی طرف سے سعد بن عبادہ نے اٹھ کر کہا "کیا حضور کا اشارہ ہماری طرف ہے؟ ہم تو ہر حال میں آپ کے ساتھ ہیں۔ ہمارا زر و مال حاضر ہے اور جہاں تک ہماری

جانوں کا سوال ہے، خدا کی قسم اگر حضور حکم دیں تو ہم سمندر میں کود پڑیں۔" اور مقداد نے کہا "ہم موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہ کہیں گے کہ آپ اور آپ کا خدا جا کر لڑیں اور ہمیں ہمارے گھروں ہی میں رہنے دیں۔ ہم آپ کے داہنے اور بائیں اور آگے اور پیچھے جنگ کرنے کے لئے تیار ہیں[۱]۔"

غرض ۱۲ ار رمضان سنہ ۲ ہجری کو آپ تقریباً تین سو مجاہدین کے جلو میں مدینہ سے نکلے۔ لشکر میں صرف دو گھوڑے اور ساٹھ اونٹ تھے۔ قریش کی فوج بڑی شان و شوکت سے آئی تھی، ایک ہزار سپاہی تھے، سو سواروں کا رسالہ تھا، سارے رؤسائے قبیلہ ساتھ تھے۔ بدر کے مقام پر دونوں طرف کی فوجوں نے پڑاؤ کیا۔ اتنے میں رات ہو گئی۔ تمام صحابہ نے رات بھر آرام کیا، بجز آنحضرت صلعم کی ذات کے جو صبح تک دعا میں مصروف رہی۔ صبح ہوئی تو آپ نے لوگوں کو نماز کے لئے پکارا، بعد نماز جہاد پر خطبہ دیا۔ اس سے فارغ ہو کر آپ نے صف آرائی شروع کی۔ دستِ مبارک میں ایک تیر تھا، اس کے اشارہ سے صفیں آراستہ کرتے تھے۔ لڑائی میں شور و غل ہوتا ہی رہتا ہے لیکن آپ نے منع کر دیا کہ کسی کے منھ سے کوئی آواز نہ نکلے۔

آنحضرت صلعم چونکہ اپنے ہاتھ خون سے آلودہ کرنا نہیں پسند کرتے تھے، صحابہ نے آپ کے لئے میدان کے کنارے ایک چھوٹا سا سائبان تیار کر دیا تھا۔ صفیں آراستہ کر کے آپ اسی میں تشریف لے آئے۔ اسی اثنا میں دو صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان اور حضرت حسیل جو کہیں سے آ رہے تھے قریش کے روکنے پر عدم شرکت کا وعدہ کر کے آپ کے پاس پہنچ گئے اور جنگ میں حصّہ لینے کی اجازت چاہی۔ مسلمانوں کی تعداد اتنی کم تھی کہ ایک آدمی بھی اگر بڑھ جاتا تو بہت ہوتا۔ لیکن آپ نے یہ صورت پسند نہ کی اور فرمایا "ہم ہر حال میں وعدہ

---

[۱] زاد المعاد صـ ۳۲۷

وفا کریں گے ہمکو بس خدا کی مدد درکار ہے۔"

نقارہ جنگ بجا اور قریش کے لشکر نے پیش قدمی کی۔ اب خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت، اسلام و کفر کی فوجیں ایک دوسرے کے مقابل تھیں۔ انسانیت کی تقدیر کے فیصلہ کی آخری گھڑی آپہنچی تھی ـــ اور یہ فیصلہ صرف چند جانوں پر منحصر تھا۔ آنحضرت صلعم پر ایک والہانہ کیفیت طاری تھی۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر فرماتے تھے۔ "اے خدا! تو نے جو وعدہ مجھ سے کیا ہے، اسے پورا کر۔" بیخودی کے عالم میں چادر کاندھوں سے گر گر جاتی اور آپ کو خبر تک نہ ہوتی۔ کبھی بے اختیار ہو کر پیشانی زمین پر رکھ دیتے اور کہتے "خدایا! اگر یہ چند آدمی آج مارے گئے تو پھر دنیا میں تیری عبادت کرنے والا کوئی نہ ہوگا۔"

قریش کی فوجیں اب بالکل قریب آگئیں، پھر بھی آپ نے صحابہ کو پیش قدمی سے روکا اور فرمایا کہ جب دشمن پاس آجائے تو اسے تیر سے روکو۔

بقول علامہ شبلی "یہ معرکہ ایثار اور جانبازی کا سب سے بڑا حیرت انگیز منظر تھا۔ دونوں فوجیں سامنے آئیں تو لوگوں کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر کے ٹکڑے تلوار کے سامنے ہیں حضرت ابوبکر کے بیٹے (جو اب تک کافر تھے) میدان جنگ میں بڑھے تو حضرت ابوبکر تلوار کھینچ کر نکلے۔ حضرت عمر کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔"[۱]

جنگ کا آغاز یوں ہوا کہ عمرو بن الحضرمی جو تجارتی قافلہ پر حضرت عبدالرحمٰن کی غلطی سے حملہ کر دینے کے نتیجہ میں مارا گیا تھا اسکا بھائی عامر حضرمی آگے بڑھا اور اس نے مسلمانوں کو للکارا۔ مسلمانوں کیطرف سے حضرت عمر کا غلام مہجع اسکے مقابلہ کیلئے نکلا اور مارا گیا۔ کچھ دیر تک اسی طرح فرداً فرداً مقابلہ ہوتا رہا۔ کفار کی طرف سے ایک ایک دو دو، تین تین آدمی میدان میں اترتے اور للکارتے۔ مسلمانوں کی فوج سے انکے مقابلہ کو اسی تعداد میں مجاہد جاتے اور جنگ کرتے۔ اس مقابلہ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا اور حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت زبیر نے اپنی تلواروں کی نوکوں سے جوش ایمانی اور قوت و شجاعت کے نئے باب لکھے جو تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

---

[۱] سیرت النبی ج ۱۔ ص ۳۲۷-۳۱۷

اسکے بعد عام حملہ شروع ہوا۔ دونوں لشکر بڑھے اور ایک دوسرے سے گتھ گئے۔

ابوجہل کی روز افزوں عداوت اور مفسدین کے باعث انصار میں سے دو بھائیوں، معوذ اور معاذ نے عہد کیا تھا کہ وہ جہاں بھی نظر آئے گا یا اسے ختم کر دینگے یا خود ختم ہو جائیں گے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف کا بیان ہے کہ میں صف میں تھا کہ یکایک مجھ کو داہنے بائیں دو نوجوان نظر آئے۔ ایک نے بڑھکر مجھ سے پوچھا کہ "ابوجہل کہاں ہے؟" میں نے کہا کہ "بھتیجے! ابوجہل کو پوچھ کر کیا کرو گے؟" اس نے جواب دیا کہ میں نے قسم کھائی ہے کہ ابوجہل کو جہاں دیکھوں گا یا تو اسے مار ڈالوں گا یا خود جان دے دوں گا" میں اس سے باتیں کر ہی رہا تھا کہ دوسرے نے بھی مجھ سے یہی سوال کیا۔ میں نے اشارہ سے بتایا کہ ابوجہل وہ ہے۔ بس وہ باز کی طرح جھپٹے اور ابوجہل خاک پر تھا۔ وہ نوجوان عفراء کے بیٹے معوذ اور معاذ تھے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ نے پیچھے سے آکر معاذ کے شانہ پر تلوار ماری جس سے بازو کٹ گیا، مگر تسمہ باقی لگا رہا، معاذ نے عکرمہ کا پیچھا کیا لیکن وہ بچکر نکل گیا، معاذ اسی طرح لڑتے رہے۔ ہاتھ کے لٹکنے سے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زحمت ہوتی تھی چنانچہ انھوں نے ہاتھ کو پاؤں کے نیچے دبا کر اس زور سے گھسیٹا کہ تسمہ الگ ہو گیا۔ اب وہ آنا د تھے

شام ہوتے قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلے[1]

اسکے بعد جنگوں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو کہیں چار سال بعد ۶ھ میں صلح حدیبیہ کی بدولت سرزمین عرب کو تھوڑا بہت اطمینان میسر آیا

(۳)

مہاجروں کو مکہ کی یاد اکثر ستایا کرتی تھی۔ وطن کی یاد کسے نہیں ستاتی۔ ان کے بہت سے

---

[1] سیرۃ النبی، جلد اول، صفحات ۳۲۷ - ۳۱۷

اعزا اب بھی وہیں رہتے تھے جن کو نہ تو قریش سکون سے بیٹھنے ہی دیتے تھے اور نہ ہجرت ہی کرنے دیتے تھے۔ اس کے علاوہ ابراہیم کے زمانہ سے تمام عرب خانۂ کعبہ کو مقدس سمجھتے آئے تھے۔ اَشْہُرِ حُرُم میں وہ اپنی خانہ جنگیاں بند کر کے مکّہ آتے تھے اور مذہبی رسوم ادا کرتے تھے۔ اسلام میں بھی حج فرائض چہارگانہ میں سے ہے۔ ادھر غزوۂ خندق میں ناکامی کا منھ دیکھنے کے بعد قریش کے جارحانہ عزائم میں بھی کمی آگئی تھی، غرض مختلف اسباب کی بنا پر ذیقعدہ ۶ھ میں مسلمانوں نے مکہ معظمہ جا کر عمرہ کرنے کا ارادہ کیا اور آنحضرت صلعم نے بھی تیاری فرمائی

چودہ سو افراد اس سفر کے لئے تیار ہوئے۔ آنحضرت صلعم نے اس خیال سے کہ قریش کو کوئی اور اندیشہ نہ ہو حکم فرمادیا کہ کوئی شخص ہتھیار باندھ کر نہ چلے۔ صرف تلوار کی اجازت تھی جو عرب میں سفر کا ضروری آلہ سمجھی جاتی تھی لیکن وہ بھی اس شرط پر کہ نیام میں بند رہے۔ قریش کو پہلے سے اطلاع بھی کردی گئی کہ ہم لوگ محض مذہبی فرض کی ادائیگی کے لئے آرہے ہیں اور جنگ کا کوئی سامان ہمارے ساتھ نہیں ہے۔

اِدھر یہ قافلہ چلا ادھر قریش نے قبائل کو جمع کرنا شروع کردیا اور سب کے سامنے قسم کھائی کہ محمدؐ کو مکّہ نہ آنے دیں گے۔ مقابلہ کا پورا انتظام کیا گیا۔ اور ابوجہل کا بیٹا عکرمہ دو سو سواروں کا دستہ لے کر آگے بڑھا۔ ان حالات کے پیش نظر آنحضرت صلعم مکّہ سے ۱۰ – ۱۲ میل قبل حدیبیہ ہی میں ٹھہر گئے اور قریش کے پاس کہلا بھیجا کہ " ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا ہمارا مقصد نہیں ہے، ہم سے جنگ کر کے تم یونہی کافی تباہ ہو چکے ہو، بہتر ہو گا کہ ہم لوگ اب صلح کر لیں، ورنہ تمھاری مرضی "۔

مسلمان سفراء مکہ پہنچے تو قریش کے شدت پسند عناصر نے انھیں بولنے تک نہ دیا۔ قریش کے ایک معزز بزرگ عروہ بن مسعود نے بیچ میں پڑ کر مصالحت کی صورت پیدا کرائی۔ وہ خود پیغمبر صلعم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ واپسی پر جو تاثرات اس نے بیان کئے وہ قابل ذکر ہیں۔ اس نے قریش سے کہا "میں نے نجاشی، قیصر اور کسریٰ کے دربار دیکھے ہیں مگر یہ عقیدت اور وابستگی کہیں نہیں دیکھی جو اصحاب محمدؐ کو محمدؐ سے ہے۔ محمدؐ جب بات کرتے ہیں تو سناٹا چھا جاتا ہے، حکم دیتے ہیں تو تعمیل کے لئے سب مبادرت کرتے ہیں۔ وضو کرتے ہیں تو جو پانی گرتا ہے اس پر ایک مجمع ٹوٹ پڑتا ہے، اور تھوکتے ہیں تو آب دہن زمین تک نہیں پہنچ پاتا کہ لوگ ہاتھوں میں لے لیتے ہیں اور اپنے چہروں پر ملنے لگتے ہیں۔ ان کا اتنا رعب ہے کہ کوئی نظر بھر کر ان کی طرف نہیں دیکھ سکتا۔"

عروہ صلح کی گفتگو ناتمام چھوڑ گیا تھا، اس لئے آنحضرت صلعم نے حراش بن اُمیّہ کو مکہ بھیجا، مگر قریش کے کچھ لوگوں نے انھیں راستہ میں گھیر لیا اور ان کا اونٹ مار ڈالا۔ وہ جان بچا کر حدیبیہ لوٹ آئے۔ تب حضرت عثمان سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ قریش نے ان کو نظر بند کر لیا اور کچھ ایسا ہوا کہ ان کے قتل کی افواہ پھیل گئی۔ یہ خبر آنحضرت صلعم کو پہنچی تو آپ نے فرمایا کہ عثمان کا قصاص لینا فرض ہے اور ایک ببول کے درخت کے نیچے بیٹھ کر آپ نے صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ مسلمان بے سر و سامان تھے ہتھیار مدینہ ہی میں چھوڑ آئے تھے، لیکن اس کے باوجود ایک ایک شریک سفر نے جس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی، آپ کے دست مبارک پر عہد کیا کہ اگر جنگ کی نوبت آئی تو اپنی جانوں سے گزر جائیں گے۔ یہ واقعہ اسلام کی تاریخ کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے،

اسے بیعۃ رضوان کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرت عثمان کی شہادت کی اطلاع غلط ثابت ہوئی تو صلح کے مذاکرات پھر شروع ہوئے اور بالآخر سمجھوتہ ہوگیا۔ آنحضرت صلعم خود امی تھے اسلئے آپ نے حضرت علی سے صلحنامہ لکھنے کو کہا۔ انھوں نے مسلمانوں کے دستور کے مطابق مسودہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا۔ اس پر قریش کے نمائندہ نے اعتراض کیا کہ ہم نہیں جانتے کہ رحمٰن کسے کہتے ہیں۔ پیغمبر اسلام کے حکم سے یہ عبارت کاٹ دی گئی۔ دوسرا جملہ یہ تھا "یہ معاہدہ محمد رسول اللہ اور قریش کے درمیان ہوتا ہے۔" قریش اس پر بھی معترض ہوئے۔ انھوں نے کہا اگر ہم آپ کو خدا کا رسول ہی مان لیں تو پھر جھگڑا کس بات کا رہ جاتا ہے؟ آپ صرف اپنا نام اور ولدیت لکھوایئے۔" آپ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جو قریش کہتے ہیں وہی لکھا جائے۔ حضرت علیؓ وفا شعاری کا پیکر تھے۔ لیکن اس امر کی تعمیل ان سے نہ ہوسکی۔ انھوں نے عرض کیا "میں یہ تحریر ہرگز نہ مٹاؤں گا۔" آپ نے فرمایا "اچھا بتاؤ کہ میرا نام کہاں لکھا ہے؟" حضرت علیؓ نے اس جگہ پر انگلی رکھدی اور آپنے ہاتھ میں قلم لیکر "رسول اللہ" کے لفظ پر پھیر دیا۔

معاہدہ کی شرطیں یہ تھیں[۵]:-

(۱) مسلمان اس سال واپس چلے جائینگے لیکن آئندہ سال وہ عمرہ کرنے آئیں گے اور کوئی روک ٹوک نہ ہوگی۔ وہ اپنے ساتھ کوئی ہتھیار نہیں لائیں گے۔ علاوہ تلوار کے جو نیام سے نکالی نہیں جائے گی اور مکہ میں وہ تین دن سے زیادہ قیام نہیں کرسکیں گے۔

(۲) مکہ میں جو مسلمان مقیم ہیں ان میں سے وہ کسی کو اپنے ساتھ نہیں لیجائیں گے۔

---

[۵] صحیح بخاری، کتاب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ

لیکن قافلہ کے ساتھ آئے ہوئے مسلمانوں میں سے اگر کوئی مکہ میں رک جانا پسند کرے تو اسے پیغمبر صلعم کی طرف سے اجازت ہوگی۔

(۳) اگر قریش کا کوئی شخص بھاگ کر مسلمانوں کے پاس پہنچ جائے گا تو واپس کر دیا جائے گا لیکن اگر کوئی مسلمان آکر قریش سے مل جائے گا تو وہ واپس نہ کیا جائے گا۔

(۴) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ وہ مسلمانوں اور قریشیوں میں سے جس سے چاہیں معاہدہ کرلیں۔

(۵) دس سال تک فریقین میں جنگ بند رہے گی اور تمام جھگڑے فراخدلی کے ساتھ طے کئے جایا کریں گے۔

معاہدہ ابھی لکھا ہی جا رہا تھا کہ ابو جندل جو مکہ میں مسلمان ہو گئے تھے اور اس جرم میں قید کر دئے گئے تھے پاؤں میں بیڑیاں پہنے گرتے پڑتے رسول اللہ صلعم کی خدمت میں پہنچ گئے، انھیں دیکھ کر قریش مکہ کے نمائندے نے کہا کہ "معاہدہ کی رو سے ان کو ہمارے حوالہ کر دیا جائے"۔ آنحضرت صلعم نے اسے سمجھایا کہ جب تک معاہدہ پر دستخط نہ ہو جائیں اس کا نفاذ نہیں ہوتا"۔ لیکن اس نے ضد کی اور کہا کہ "ایسی صورت میں ہمیں صلح ہی منظور نہیں ہے"۔ مجبوراً آنحضرت صلعم نے اس کی بات مان لی۔ ابو جندل کو قریش نے اتنا مارا تھا کہ ان کے جسم پر داغ پڑ گئے تھے۔ انھوں نے وہ داغ مسلمانوں کو دکھائے اور کہا کہ "بھائیو! کیا تم پھر مجھے انہی ظالموں کے سپرد کر دوگے؟ صحابہ کے دل پر سخت چوٹ لگی۔ وہ بہت مضطرب اور رنجیدہ ہوئے مگر بقول ڈاکٹر حمید اللہ مسلمانوں میں ضبط و نظم اتنا پیدا ہو چکا تھا کہ جب ان کے سردار نے ایک بات پر رضامندی دے دی تو ان کو خاموشی اور اطاعت شعاری کے سوا کچھ نہ سوجھا[1]۔

---

[1] رسول اکرم کی سیاسی زندگی صہ ۱۲۴

صلح حدیبیہ جو بظاہر مسلمانوں کے خلاف معلوم ہوتی تھی تدبّر اور سیاسی دور اندیشی کا ایسا شاہکار ثابت ہوئی کہ اس پر دستخط ہونے کے دو سال کے ...... مختصر عرصہ کے اندر اسلام مکہ اور سارے عرب پر غالب آگیا۔ علامہ شبلیؒ نے اسے اسلام کی تمام آئندہ کامیابیوں کا دیباچہ" قرار دیا ہے۔ امام زہری اسکے مفید نتائج کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ آمد و رفت کی بندشیں اٹھ جانے سے مشرکین تجارت اور دوسرے اغراض سے مدینہ آکر مہینوں قیام کرنے لگے۔ اس طرح ان کو اسلام جاننے اور برتنے کا موقع ملا۔ روزمرہ کی زندگی میں مسلمانوں کی اخلاقی پاکیزگی اور برتری نے ان کے دلوں پر وہ اثر کیا جو برسوں کی جدوجہد نہ کرسکی تھی مسلمان بھی آزادی سے مکہ جاتے اور اگرچہ اپنی دعوت کی بابت زبان سے کچھ نہ کہتے مگر ان کا عمل سیکڑوں تقریروں اور وعظوں کا کام کرتا اور دین کے منکروں کو دین کی طرف کھینچتا، اس سال جتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے، قریش کے فخر روزگار سپہ سالار خالد بن ولید جن کی آخری لمحہ کی تدبیر نے جنگِ اُحد میں مسلمانوں کے جیتے ہوئے میدان کو پلٹ دیا تھا اسی زمانہ میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔

(۴)

قریش کی طرف سے اطمینان ہوتے ہی حضور سرور کائنات نے اپنی رسالت کے عالمگیر پہلو کی طرف عملی توجہ فرمائی۔ ایک روز آپ نے کل صحابہ کو جمع کرکے خطبہ دیا کہ خدا مجھ کو تمام دنیا کے لئے رسول اور رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرح آپس میں اختلاف نہ کرنا۔ جاؤ میری طرف سے پیغام حق ادا کرو" اسکے بعد آپ نے شاہانِ وقت مثلاً قیصر (روم) خسرو (ایران) مقوقس (مصر) نجاشی (حبش) منذر بن حارث (گورنر شام) ثمامہ (نجد) جبلہ (غسّان) ہوذہ بن علی (یمامہ) جیفر (عمان) وغیرہ کے پاس

اپنے مخصوص سفرا کے ذریعے دینی دعوت نامے روانہ فرمائے۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب "رسول اکرم کی سیاسی زندگی" میں ان میں سے بعض مکتوبات کی عکسی تصویریں شائع کی گئی ہیں۔

قیصر روم کے پاس مکتوب گرامی لے کر حضرت دحیۃ کلبی گئے تھے۔ ان دنوں وہ ایرانیوں پر فتحیابی کا شکریہ ادا کرنے بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ وہیں اس کو خط ملا۔ اس نے خط پا کر حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص مل سکے تو لاؤ۔ اتفاق سے ابو سفیان (جو اس وقت تک کافر اور آنحضرت صلعم کے جانی دشمن تھے) کچھ اور عرب تاجروں کے ساتھ غزّہ میں مقیم تھے۔ قیصر کے آدمی ان کو غزّہ سے جا کر لے آئے۔

قیصر نے خاص دربار منعقد کیا۔ اپنے تخت کے چاروں طرف پادریوں اور راہبوں کی صفیں قائم کیں اور عربوں سے مخاطب ہو کر بولا کہ تم میں سے کوئی مدعی نبوت کا رشتہ دار بھی ہے"۔ ابو سفیان نے عرض کیا کہ میں ہوں"۔ تب قیصر نے دوسرے عرب کے تاجروں سے کہا کہ دیکھو میں ان سے کچھ سوال کروں گا۔ اگر یہ کسی کا غلط جواب دیں تو مجھے بتا دینا۔ ابو سفیان کا بیان ہے کہ اگر مجھے یہ ڈر نہ ہوتا کہ میرے ساتھی میرا جھوٹ کھول دیں گے تو میں خوب باتیں بناتا اور جو جی میں آتا کہتا مگر اس مجبوری میں مجھے سچ سچ ہی کہنا پڑا۔ اسکے بعد قیصر اور ابو سفیان میں یہ گفتگو ہوئی۔

قیصر — مدعی نبوّت کا خاندان کیسا ہے؟"

ابو سفیان — شریف ہے۔

قیصر — اس کے خاندان میں کسی اور نے بھی نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟

ابو سفیان — نہیں۔

قیصر — اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان — نہیں

قیصر — اسکے پیروؤں میں کمزور لوگ زیادہ ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان — کمزور۔

قیصر — اس کے پیرو بڑھ رہے ہیں یا گھٹتے جا رہے ہیں؟

ابوسفیان — بڑھ رہے ہیں۔

قیصر — تم لوگوں نے کسی معاملہ میں اسے جھوٹا بھی پایا ہے؟

ابوسفیان — نہیں

قیصر — کبھی عہد و پیمان کی اس نے خلاف ورزی کی ہے؟

ابوسفیان — ابھی تک ایسا نہیں ہوا، لیکن اب جو نیا معاہدہ صلح ہوا ہے اس میں دیکھیں وہ کیسا رہتا ہے

قیصر — تم لوگوں نے کبھی اس سے جنگ بھی کی؟

ابوسفیان — ہاں

قیصر — نتیجۂ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان — کبھی ہماری فتح ہوئی کبھی اس کی۔

قیصر — وہ کیا سکھاتا ہے؟

ابوسفیان — کہتا ہے کہ بس ایک خدا کی عبادت کرو۔ کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ نماز پڑھو، سچ بولو، پاکدامن رہو، صلۂ رحمی کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا کہ "تم نے اس کو شریف النسب بتایا۔ پیغمبر ہمیشہ اچھے

خاندانوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اسکے خاندان میں اس سے پہلے کسی نے نبوت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اسی کا اثر ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں گذرا ہے، ورنہ میں خیال کرتا کہ اسکو بھی بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم تسلیم کرتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں کہا۔ جو شخص آدمیوں میں جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے، پیغمبروں کے پیرو شروع میں ہمیشہ غریب ہی ہوتے ہیں۔ تم مانتے ہو کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے۔ سچے مذاہب کا یہی حال ہوتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ اس نے کبھی فریب نہیں کیا۔ پیغمبر کبھی فریب نہیں کرتے۔ تم کہتے ہو کہ وہ نماز، تقویٰ اور پرہیزگاری کی تعلیم دیتا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو جس جگہ میں بیٹھا ہوں ایک روز وہ اس کے قبضہ میں ہوگی۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ میں اگر وہاں جا سکتا تو خود اس کے پاؤں دھوتا۔

تقریر ختم ہوئی تو قیصر نے حکم دیا کہ رسول اللہ صلعم کا خط دربار میں پڑھ کر سنایا جائے۔ وہ خط یہ تھا:۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم — محمدؐ کی طرف سے، جو خدا کا بندہ اور رسول ہے، یہ خط ہرقل کے نام ہے جو روم کا رئیس اعظم ہے۔ اس کو سلامتی ہو جو ہدایت کا پیرو ہے۔ اس کے بعد میں تجھ کو اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام لا، تو سلامت رہے گا، خدا تجھ کو دوگنا اجر دے گا۔ اور اگر تو نہ مانا تو اہل ملک کا گناہ تیرے اوپر ہوگا۔ اے اہل کتاب ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہم میں

ؐ صحیح بخاری

اور تم میں یکساں ہے، وہ یہ کہ ہم خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجیں، اور ہم
میں سے کوئی کسی کو (خدا کے علاوہ) خدا نہ بنائے۔ اور تم نہیں مانتے
تو گواہ رہو کہ ہم مانتے ہیں[1]"

اہل دربار قیصر اور ابو سفیان کی گفتگو سن کر ہی پیچ و تاب کھانے لگے تھے۔ نامۂ
مبارک پڑھ کر سنایا گیا تو وہ اور بھی برہم ہوئے۔ ہرقل (قیصر) نے یہ فضا دیکھی تو عربوں کو
دربار سے اٹھوا دیا۔ اور جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے "گو کہ اس کے دل میں نور اسلام
آچکا تھا لیکن تاج و تخت کی تاریکی میں وہ روشنی بجھ کر رہ گئی[2]۔

معاہدۂ حدیبیہ نے قبائل کو اختیار دیدیا تھا کہ وہ مسلمانوں یا قریش جن سے چاہیں،
دوستانہ تعلقات قائم کرلیں۔ چنانچہ بنو خزاعہ مسلمانوں کے شریک ہو گئے تھے۔ ان میں اور بنو بکر
میں پرانی عداوت چلی آتی تھی، ان کا ہر کام ایک دوسرے کی ضد اور مخالفت میں ہوتا تھا۔
اسلئے بنو بکر نے جواباً قریش سے معاہدہ کرلیا

طلوع اسلام کے بعد تمام غیر مسلم عربوں کی توجہ کا مرکز مسلمان بن گئے تھے۔
بنو خزاعہ اور بنو بکر کی آپس کی جنگوں میں بھی کمی آگئی تھی، لیکن صلح حدیبیہ کے باعث عرب
میں کسی قدر امن و سکون جو قائم ہوا تو بنو بکر نے پرانی تاریخ پھر تازہ کرنے کی ٹھانی اور
رؤسائے قریش کی اعانت سے ۸ھ میں بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ خزاعہ نے مجبور ہو کر
حرم میں پناہ لی، اور ان کے چالیس ناقہ سوار فریاد لے کر مدینہ پہنچے۔ رسول اللہؐ مسجد نبوی
میں تشریف فرما تھے کہ وفد خزاعہ کے پیش رو عمرو بن سالم کی دردناک آواز سنائی دی۔
"اے خدا میں محمدؐ کو وہ معاہدہ یاد دلاؤں گا جو ہمارے اور ان کے خاندانوں

---

[1] صحیح بخاری [2] سیرۃ النبی، ج ۱، ص ۴۶۷

میں ہوا ہے۔ اے پیغمبر خدا ہماری مدد کر اور خدا کے بندوں کو بلا۔ وہ سب مدد کے لئے جمع ہوں گے۔"

قریش کی اس بدعہدی سے آپ بہت ملول ہوئے۔ تاہم آپ نے ضبط فرمایا اور ایک خاص قاصد کے ذریعہ قریش کے پاس یہ تین شرطیں بھیجیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کرلو (۱) مقتولین کا خونبہا ادا کیا جائے (۲) قریش بنو بکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ (۳) معاہدہ حدیبیہ منقطع کر دیا جائے۔ قریش نے پہلے تو غصہ میں کہہ دیا کہ انھیں صرف تیسری شرط منظور ہے مگر قاصد کے لوٹنے کے بعد انھوں نے پھر سوچا اور اپنا ایک نمائندہ مدینہ بھیجا کہ صلح حدیبیہ کی تجدید کرلائے، مگر قریش کی سابقہ بدعہدیوں، گستاخیوں اور شرانگیزیوں کے پیش نظر آنحضرت صلعم زیادہ ملتفت نہ ہوئے اور مکہ کی تیاریاں شروع کردیں

۱۰ رمضان ۸ھ کو دس ہزار مجاہدوں کی جمعیت میں آپ نے مدینہ سے کوچ فرمایا۔ راستہ میں کچھ قبائل بھی آکر شریک ہو گئے۔ قریش نے یہ خبر سنی تو تحقیق کے لئے اپنے چند آدمی بھیجے جن میں ابوسفیان بھی تھے۔ ان کو خیمۂ نبوی کے محافظ نے دیکھ لیا اور گرفتار کرکے بارگاہ رسالت میں پیش کیا۔ ابوسفیان کی اسلام دشمنی خفیہ چیز نہ تھی۔ وہ ایک بار رسول اللہ صلعم کے قتل کی سازش بھی کر چکے تھے۔ درحقیقت ان کی ہر سازش ان کے قتل کی دعویدار تھی مگر عفو محمدی جذبۂ انتقام پر غالب آیا آپ نے انھیں معاف کر دیا۔ رحم و رحمت کے اس سلوک کا ابوسفیان پر ایسا اثر پڑا کہ انھوں نے وہیں اسلام قبول کر لیا۔

لشکر اسلام مکہ کی طرف بڑھا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عباس

سے ارشاد فرمایا کہ ابوسفیان کو لیجاکر پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کردو کہ وہ اپنی آنکھوں سے اللہ کے سپاہیوں کا جلال دیکھ لیں۔ سب سے پہلے غِفار کا پرچم نظر آیا۔ پھر دوسرے قبیلوں کے دستے آئے اور تکبیر کے نعرے لگاتے گذر گئے، سب کے بعد انصار کا قبیلہ اس سازو سامان سے آیا کہ آنکھیں خیرہ ہوگئیں۔ ابوسفیان نے حیرت سے پوچھا کہ یہ کون لشکر ہے۔ حضرت عباس نے نام بتایا۔ اتنے میں سردار فوج حضرت سعد بن عبادہ ہاتھ میں علم لئے برابر سے گذرے اور ابوسفیان کو دیکھ کر پکار اٹھے۔

الیوم یوم الملحمۃ الیوم تستحل الکعبۃ	آج گھمسان کا دن ہے۔ آج کعبہ حلال کردیا جائے گا، یعنی کعبہ میں خونریزی آج حرام نہ رہے گی۔ آج وہاں خوب خون بہایا جائے گا۔

سب سے آخر میں کوکبۂ نبوی نور افشانی کرتا ہوا نمودار ہوا۔ ابوسفیان کی نظر چہرۂ مبارک پر پڑی تو آواز بلند کرکے عرض کیا کہ "حضور نے سنا کہ سعد بن عبادہ ابھی کیا کہتے ہوئے گئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آج کعبہ حلال کردیا جائے گا۔" ارشاد ہوا کہ "عبادہ نے غلط کہا آج کعبہ کی عظمت کا دن ہے۔" یہ کہہ کر حکم دیا کہ فوج کا عَلَم عبادہ سے لیکر ان کے لڑکے کو دیدیا جائے۔ جب اسلامی افواج مکہ میں داخل ہوئیں تو آپ کے حکم سے اعلان کردیا گیا کہ:۔

(۱) جو شخص ہتھیار ڈال دے اسے قتل نہ کیا جائے۔

(۲) جو شخص خانہ کعبہ یا ابوسفیان یا حکیم بن حزام کے گھروں میں پناہ گزین ہو جائے اسے امان دیجائے۔

(۳) جو لوگ اپنے گھروں کے دروازے بند کرلیں ان سے جنگ نہ کی جائے۔

(۴) دشمن کے زخمیوں اور اسیروں کو قتل نہ کیا جائے

اہلِ مکّہ کی طاقت اتنی ٹوٹ چکی تھی اور وہ مسلمانوں سے ایسا مرعوب ہو چکے تھے کہ ان کی اکثریت نے اوپر کی تین شرطوں میں سے ایک نہ ایک پر عمل کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ باقی نے مقابلہ کیا مگر جلد ہی ۲۸ مقتولین چھوڑ کر بھاگ نکلے اور مکہ فتح ہو گیا۔

رسول اللہ صلعم شہر میں داخل ہوئے تو اس طرح کہ سر جھکا ہوا اور ہونٹوں پر سورۂ فتح کی تلاوت جاری تھی۔ اونٹ پر آپ کے ساتھ آپ کے آزاد کردہ غلام زید کے بیٹے اسامہ بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ سیدھے حرم شریف تشریف لے گئے اور اسے بتوں سے پاک کیا آپ باطل خداؤں کے باطل مجسموں کو لکڑی کی نوک سے ٹھوکے دیتے جاتے تھے اور فرماتے جاتے تھے۔

جاء الحق وزھق الباطل وما یبدئ الباطل وما یعید

حق آگیا اور باطل چلا گیا اور اب باطل پھر نہ آئے گا۔

عثمان بن ابی طلحہ خانۂ کعبہ کے موروثی کلید بردار تھے۔ آپ نے ان سے کنجی طلب کی۔ آج ان کے لئے عجیب عبرت کا دن تھا۔ آغازِ نبوت میں ایک بار آپ نے ان سے بیت اللہ کا دروازہ کھولنے کو کہا تھا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس پر آپ نے فرمایا تھا "نہ کھولو، مگر ایک دن تم دیکھو گے کہ یہ کنجی میرے ہاتھ میں ہو گی اور میں جسے چاہوں گا دوں گا۔" عثمان جھنجھلا کر بولے تھے۔ "کیا اس دن سارے قریش ناکارہ اور ذلیل ہو جائیں گے؟" آپ نے جواب دیا تھا "نہیں اس دن وہ آج سے زیادہ معزز ہوں گے۔"

عثمان خوف و ندامت سے عرق عرق ہو رہے تھے لیکن جبینِ رحمت پر شکن

تک نہ تھی۔ عثمان نے کنجی پیش کی۔ آپ دروازہ کھول کر اندرونِ کعبہ تشریف لے گئے اور دو رکعت نماز شکرانہ ادا فرمائی۔

اس اثناء میں رؤسائے قریش صحن حرم میں جمع ہو گئے تھے۔ یہ وہی تھے جن کی گردنوں پر بیسیوں بے گناہ مسلمانوں کا خون تھا۔ جنھوں نے سیکڑوں مسلمانوں کو سخت سے سخت اذیتیں پہنچائی تھیں اور ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا تھا۔ بارہا مدینہ پر حملہ کیا تھا، غرضیکہ اسلام کو مٹانے اور مسلمانوں کو برباد کرنے کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا تھا۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ ان کے پاس تشریف لائے اور فرمایا:۔

اے قوم قریش! خدا نے تمھارا جاہلیت کا غرور اور نسلی افتخار توڑ دیا۔ سچ یہ ہے کہ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی تھی ۔۔۔ خدا فرماتا ہے:۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا ۚ إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ ۝

(لوگو! میں نے تمکو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے خاندان اور قبیلے بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک زیادہ شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔)

آپ نے کلید حضرت عثمان بن ابی طلحہ کو واپس کر دی، حضرت عباس نے مشورتاً عرض کیا کہ کنجی ان کے بجائے خاندان بنو ہاشم (خاندان نبوی) کو دی جائے، مگر آپ نے فرمایا "آج تو سلوک کرنے کا دن ہے۔"

پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوہ صفا پر بیٹھ کر اسلام میں داخل ہونے

والوں سے بیعت لی۔ حضرت عمر فاروق ایک ایک شخص کو پیش کرتے جاتے تھے اور آپ بیعت لیتے جاتے تھے۔ ہر شخص کو اقرار کرنا پڑتا تھا کہ میں نہ تو ذات میں اور نہ صفات میں خدا کے ساتھ کسی کو شریک کروں گا۔ نہ اس کے علاوہ کسی کی عبادت کروں گا اور نہ اس کے سوا کسی سے مدد مانگوں گا۔ چوری، زنا، خون ناحق، جھوٹ، بہتان اور لڑکیوں کو مار ڈالنے کے رواج سے دور رہوں گا اور ہر سچی بات میں اللہ کی اطاعت اپنی استطاعت بھر کروں گا۔[1]

مکہ میں مہاجروں کے مکانوں پر مشرکوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اب انھوں نے ان کی واپسی کی درخواست کی، لیکن آپ نے ان کو حکم دیا کہ وہ از خود دست بردار ہو جائیں، گویا بقول قاضی سلیمان منصور پوری علیہ الرحمۃ آپ کا مدعا یہ تھا کہ "جن چیزوں کو تم خدا کے لئے چھوڑ چکے اب ان کی واپسی کا سوال کیوں کرتے ہو"۔[2]

(۵)

مکہ قلب عرب تھا اور بیت اللہ کے مجاور ہونے کی حیثیت سے قریش وہاں کی سب سے زیادہ مفتخر قوم تھے۔ اس بناء پر قبائل نے عموماً مسلمانوں اور قریش کے معرکہ ہی کو اسلام کی صداقت کا معیار قرار دے لیا تھا اور کہتے تھے کہ اگر قریش مغلوب ہو گئے اور مکہ فتح ہو گیا تو ہم اسلام قبول کر لیں گے۔ مکہ جب فتح ہو گیا تو انھوں نے خود پیش قدمی کی۔ ان کے سر برآوردہ لوگ بارگاہ رسالت میں حاضر ہوتے، اپنی نافرمانیوں کی معافی چاہتے توبہ کرتے، کلمہ پڑھتے اور دین کی باتیں سیکھتے۔ آنحضرت صلعم بہ نفس نفیس ان کی تواضع کا اہتمام فرماتے، آپ کو اس کا اتنا خیال تھا کہ آپ کی آخری وقت کی وصیتوں میں ایک

---

[1] طبری
[2] رحمۃ للعالمین، جلد ۱، صفحہ ۱۵۹

وصیت یہ بھی تھی کہ جس طرح میں وفود کو عطیے دیا کرتا تھا تم بھی دیا کرنا۔"

سنہ ۱۰ھ میں آنحضرت صلعم نے حج کا ارادہ فرمایا اور اس کی اطلاع تمام اطراف میں کرادی۔ خبر پاکر ہر درجہ اور ہر طبقہ کے لاتعداد لوگ مدینہ طیبہ میں جمع ہو گئے۔ آپ نے ان سب کو شریک سفر بنالیا۔ ذو الحلیفہ میں آپ نے احرام باندھا۔ حضرت انسؓ راوی ہیں کہ میں نے نظر اٹھاکر دیکھا تو ہر طرف آدمی ہی آدمی تھے۔ آنحضرت صلعم جب لبیک فرماتے تو زائرین بھی آواز ملاتے اور ان کے نعروں سے میدان اور پہاڑ گونج اٹھتے۔"

فتح مکہ کی مہم میں آپ نے جن جن منازل میں نماز ادا فرمائی تھی لوگوں نے وہاں مسجدیں تعمیر کرلی تھیں۔ آپ ان میں نماز ادا کرتے جاتے۔ ذوالحجہ کی چوتھی تاریخ، اتوار کے دن صبح کے وقت آپ مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ خاندان بنی ہاشم کے لڑکے راستے میں جمع ہو گئے تھے۔ آپ اپنے اونٹ پر ان میں سے کسی کو آگے اور کسی کو پیچھے بٹھا لیتے تھے۔ کعبہ نظر آیا تو آپ نے دعا کی کہ "اے اللہ! تو اس گھر کو اور زیادہ عزت اور عظمت عطا فرما۔" طواف کے بعد آپنے مقام ابراہیم میں دوگانہ ادا کیا، پھر صفا اور مروہ کی پہاڑیوں پر تشریف لے گئے اور کعبہ کی طرف رخ کرکے کلمات توحید و تکبیر ادا فرمائے۔

آٹھویں ذوالحجہ کو مکہ سے روانہ ہو کر منیٰ میں قیام فرمایا اور دوسرے دن طلوع آفتاب کے بعد وادی نمرہ میں تشریف لائے۔ دن ڈھلے عرفات پہنچے۔ سارا میدان شمع نبوت کے پروانوں سے بھرا تھا۔ آپنے ناقہ ہی پر سے خطبہ دیا۔

"لوگو! میرا خیال ہے کہ ہم تم پھر کبھی اس موقع پر یکجا نہ ہوسکیں گے۔

تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری جانیں ایک دوسرے پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تم اس دن کی، اس مہینہ کی اور اس شہر کی حرمت کرتے ہو۔

"عن قریب تم کو خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے اعمال کی بابت دریافت فرمائے گا"

"خبردار! میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

"ہاں جاہلیت کے تمام دستور میرے دونوں پاؤں کے نیچے ہیں۔"

"جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون (ربیعہ بن الحارث کا خون) باطل قرار دیتا ہوں[1]۔"

"لوگو! اپنی بیویوں کی بابت اللہ سے ڈرتے رہو۔"

"نہ تو میرے بعد کوئی پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت ہی پیدا ہوگی۔"

"لوگو! قیامت کے دن تم سے میری بابت دریافت کیا جائے گا۔ بتاؤ کہ تم کیا جواب دو گے؟"

صحابہ نے عرض کیا "ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کا کلام ہم تک پہنچا دیا اور حق رسالت ادا کر دیا۔"

آپ نے آسمان کی طرف کلمے کی انگلی اٹھا کر فرمایا "اے اللہ تو گواہ رہ۔"

طبقات ابن سعد میں مذکور ہے کہ جس کجاوہ پر سے یہ خطبہ دیا گیا تھا، اس کی قیمت ایک روپیہ سے زائد نہ تھی!

خطبہ کے اختتام پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی:۔

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَ اَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ

---

[1] ربیعہ خاندان ہاشم میں سے تھے۔ ان کو ایک شخص نے قتل کر ڈالا تھا اور ان کے خون کا انتقام لینے کا ایک خاندانی فرض چلا آتا تھا۔

وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا

(آج ہم نے تمھارا مذہب مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمھارے لئے دین اسلام منتخب کر لیا)

آج زمانہ نے ایک نیا جنم لیا تھا۔ ایک نئی شریعت اور ایک نئی امّت وجود میں آئی تھی، ارشاد ہوا "زمانہ گھوم پر کر اسی نقطہ پر آ گیا جس پر وہ زمین و آسمان کے خلق ہونے کے دن تھا۔

(۶)

یہ نبی آخر الزماں کا آخری سفر تھا۔ مکہ سے واپسی پر آپ زیادہ تسبیح و تہلیل میں مصروف رہنے لگے۔ رمضان المبارک میں یوں آپ دس روز کے لئے اعتکاف میں بیٹھتے تھے مگر اس سال آپ بیس دن معتکف رہے تھے۔

جنگِ اُحد کے شہدا کی لاشیں ہل چل اور اضطراب میں نماز جنازہ کے بغیر ہی دفن کر دی گئی تھیں۔ شروع ماہ صفر ۱۱ھ میں ایک روز آپ احد کے گنج شہیداں میں تشریف لے گئے اور شہداء کے لئے دعا فرمائی اور دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اس رقت انگیز طریقے سے ان کو وداع کیا جیسے کہ کوئی مرنے والا اپنے زندہ اعزہ کو وداع کرتا ہے[۱]۔"

اس کے بعد خطبہ دیا جس میں فرمایا:۔

مجھے اس کا خوف نہیں ہے کہ تم میرے بعد شرک کرنے لگو گے مگر اس سے ضرور ڈرتا ہوں کہ تم دنیا میں نہ مبتلا ہو جاؤ اور اسکی خاطر آپس میں کشت و خون نہ کرنے لگو۔ اور اس طرح ہلاک نہ ہو جاؤ جس طرح تم سے قبل قومیں ہلاک ہوئیں[۲]۔"

---

[۱] صحیح بخاری، باب الجنائز
[۲] ایضاً باب المغازی

ایک شب آپ نے آسودگانِ جنت البقیع کو بھی شرفِ دیدار بخشا اور صبح تک وہیں مصروفِ عبادت رہے۔ یہ عام مسلمانوں کا قبرستان تھا۔

پھر ایک دن مسلمانوں کو جمع کر کے آپنے ارشاد فرمایا "اللہ تم کو اپنی رحمت میں رکھے۔ تمہاری شکستہ دلی دور فرمائے۔ تم کو رزق دے، تمہاری مدد کرے، تم کو رفعت اور امن و امان نصیب کرے۔

"میں تم کو تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں اور اللہ ہی کو تمہارا اصل نگراں بناتا ہوں۔ اور تم کو اسی سے ڈراتا ہوں کیونکہ میں نذیر و مبین ہوں"۔

"دیکھو اللہ کے بندوں کے درمیان تکبر اور برتری نہ اختیار کرنا"۔

پھر چند آیات قرآنی تلاوت فرماکے آپ نے آخر میں فرمایا۔

"سلام تم سب پر اور ان پر جو آئندہ اسلام میں داخل ہوں گے"۔[1]

۲۹ صفر کو آپ ایک نماز جنازہ میں شرکت کر کے واپس آرہے تھے کہ مرض الموت کا حملہ ہوا۔ پہلے سر میں شدید درد ہوا، پھر بخار چڑھ آیا۔ جب تک نقل و حرکت کی طاقت رہی آپ مسجد جاکر نماز ادا فرماتے رہے۔ آخری نماز جو آپنے پڑھائی وہ مغرب کی تھی۔ عشاء کا وقت ہوا تو آپ نے دریافت کیا کہ کیا نماز ہو چکی؟ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور کا انتظار ہے۔ آپنے لگن میں پانی بھروا کر غسل کیا اور مسجد جانا چاہا لیکن غش آگیا۔ طبیعت کچھ بحال ہوئی تو آپنے پھر ارادہ کیا لیکن پھر غش آگیا۔ اور جب تیسری دفعہ بھی شدتِ ضعف سے اٹھا نہ گیا تو آپ نے حکم دیا کہ حضرت ابو بکر نماز پڑھائیں۔ حضرت عائشہ نے عرض کیا کہ "حضرت ابو بکر (جو اُن کے والد تھے) نہایت درجہ رقیق القلب ہیں۔ ان سے

---

[1] رحمۃ للعالمین، ج ۱، ص ۳۱۶

آپ کی جگہ کھڑا نہ ہوا جائے گا۔" لیکن آپ نے دن دوبارہ ان ہی کے متعلق ارشاد فرمایا چنانچہ کئی روز تک حضرت ابوبکر نے نماز پڑھائی۔

دوسرے دن ظہر کے وقت مزاج گرامی قدرے سکون پذیر ہوا تو آپ کے حکم سے پانی کی سات مشکیں آپ کے اوپر ڈالی گئیں، غسل ہو چکا تو حضرت علیؓ اور حضرت عباسؓ کے سہارے مسجد تشریف لے گئے۔ جماعت کھڑی ہو چکی تھی اور حضرت ابوبکرؓ نماز پڑھا رہے تھے۔ آپ کی آہٹ پائی تو وہ پیچھے ہٹنے لگے لیکن آپ نے اشارہ سے روک دیا، اور ان کے پہلو میں بیٹھ کر نماز پڑھائی، یعنی آپ کو دیکھ کر حضرت ابوبکرؓ نے اور ان کو دیکھ کر باقی اصحاب نے ارکان ادا کئے۔

نماز کے بعد آپ نے ایک مختصر سا خطبہ دیا۔ یہ آپ کا آخری خطبہ تھا۔ آپ نے فرمایا[1]۔

"خدا نے اپنے ایک بندے کو اس کا اختیار دیا کہ وہ خواہ دنیا کی نعمتیں قبول کرلے، خواہ آخرت میں جو کچھ ہو وہ لے لے، اور اس نے آخرت ہی کی چیزیں قبول کیں۔"

"پھر آپ نے فرمایا" میں سب سے زیادہ جس کی دولت اور صحبت کا ممنون ہوں وہ ابوبکر ہیں۔ اگر میں دنیا میں کسی کو اپنی امت میں سے اپنا دوست بنا سکتا تو ابوبکر کو بناتا، لیکن اللہ کا رشتہ دوستی کے لئے کافی ہے۔"

"تم سے پہلے قوموں نے اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا ہے مگر تم ایسا نہ کرنا۔"

اس کے بعد آپ نے انصار کی خدمات کا ذکر کیا اور ان کے معاملہ میں وصیت کی کہ "وہ اپنا فرض ادا کر چکے اب تمھیں اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ وہ میرے جسم میں مثل

---

[1] صحیح بخاری

معدہ کے ہیں جو تمھارے نفع و نقصان کا ذمہ دار ہو (یعنی جو خلیفہ مقرر ہو) اسے چاہیئے کہ ان کی نیکیوں کو قبول کرے اور خطاؤں کو معاف کر دے۔"

آگے چل کر آپ نے اس نکتہ پر زور دیا کہ شرعی احکام آپ کے نہیں بلکہ خدا کے صادر کیے ہوئے تھے۔

"حلال و حرام کی نسبت میری طرف نہ کی جائے۔ میں نے وہی چیز حلال کی ہے جو خدا نے اپنی کتاب میں حلال کی ہے اور وہی چیز حرام کی ہے جسے خدا نے حرام قرار دیا ہے۔

آخر میں آپ نے یہ نصیحت فرمائی کہ جزا و سزا کا تعلق انسان کے اپنے ذاتی اعمال سے ہے۔ کوئی کسی کو مواخذہ سے نہیں بچا سکتا۔ آپ نے فرمایا "اے پیغمبر خدا کی بیٹی فاطمہ! اور اے پیغمبر خدا کی پھوپھی صفیہ! خدا کے یہاں کے لئے کچھ کر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔"

رحلت سے ایک دن قبل آپ نے اپنے غلام آزاد کر دیئے۔ گھر میں نقد کل سات دینار تھے، آپ نے حضرت عائشہ سے فرمایا کہ "وہ دینار کہاں ہیں؟ کیا محمد خدا سے بدگمان ہو کر ملے گا؟ جاؤ انھیں خیرات کر دو۔" اسلحہ مسلمانوں کو ہبہ کر دیئے۔

شام ہوئی تو حضرت عائشہؓ کے یہاں چراغ جلانے کو تیل نہ تھا۔ ایک پڑوسن سے قرض تیل منگوایا گیا، تب چراغ جلا۔

دوسری صبح کو فجر کے وقت آپ نے وہ پردہ اٹھوایا جو حضرت عائشہؓ کے حجرہ اور مسجد نبوی کے درمیان پڑا رہتا تھا۔ نماز ہو رہی تھی۔ کچھ دیر تک آپ یہ منظر دیکھتے رہے، چہرہ پر بشاشت کی سرخی دوڑ گئی۔ آپ مسکرا دیئے پھر پردہ گرا دیا گیا۔ اس کے بعد حضورؐ کی زندگی میں کسی دوسری نماز کا وقت نہیں آیا۔

دن جیسے جیسے چڑھتا گیا آپ پر جلد جلد غشی طاری ہونے لگی۔ کچھ دیر بیہوش رہتے، پھر ہوش آجاتا پھر بیہوش ہو جاتے۔ قریب پانی کی لگن رکھی تھی۔ آپ اس میں بار بار ہاتھ ڈالتے اور چہرے پر ملتے، چہرۂ مبارک کبھی سرخ ہو جاتا کبھی زرد پڑ جاتا۔ کرب کے عالم میں کبھی چادر منھ پر ڈال لیتے، کبھی گرمی سے گھبرا کر الگ کر دیتے۔ حضرت فاطمہؓ تاب ضبط نہ لا سکیں۔ انھوں نے کہا "ہائے میرے باپ کی بے چینی" آپ نے فرمایا "آج کے بعد تمھارا باپ بے چین نہ ہوگا" بار بار یہ کلمات زبان مبارک سے ادا ہوتے لا الٰہ الّا، اِنّ لِلمَوتِ سَکَرَاتٍ۔

اتنے میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے صاحبزادے عبدالرحمٰن آگئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک تازہ مسواک تھی۔ آپ نے اس کی طرف غور سے دیکھا حضرت عائشہؓ سمجھیں کہ مسواک کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنے دانتوں سے نرم کر کے اُسے دستِ مبارک میں دیدیا۔ آپ مسواک کر ہی رہے تھے کہ سانس اکھڑ گئی۔ زبان قدسی پر یہ الفاظ تھے "نماز اور غلاموں کے حقوق" پھر آپ نے آواز قدرے بلند کر کے تین بار فرمایا۔ "بالرفیق الاعلیٰ" کہتے کہتے آواز رک گئی ہاتھ لٹک گئے، پتلیاں چھت سے لگ گئیں اور روح قدسی اپنی ابدی آرام گاہ کو پرواز کر گئی۔

اِنّا للّٰہ وَاِنَّا اِلَیہِ رَاجِعُون

اَفَاِن مِّتَ فَھُمُ الخَالِدُون

عمر مبارک قمری حساب سے ۶۳ سال ۴ دن تھی۔

آپ نے ایک بار فرمایا تھا کہ "میرے ورثا کو اشرفیاں بانٹنے کو نہ ملیں گی" یعنی نہ ہوں گی اور نہ بانٹیں گے۔ تو یہ بات اسی سے عیاں ہے کہ آخری شب چراغ میں ڈالنے

کے لئے تیل ادھار لینا پڑا تھا۔ آلات حرب میں سلطنت اسلامیہ کے تاجدار اور ملّتِ اسلامیہ کے سپہ سالار کی زرہ تیس صاع جو کے عوض میں ایک یہودی کے پاس رہن تھی، باقی اسلحہ آپ نے خود مسلمانوں کو ہبہ فرما دیئے تھے۔ ابوداؤد میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت ہے کہ "آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ دینار چھوڑے، نہ درہم، نہ اونٹ، نہ بکری۔"

متروکات میں صرف چند قطعہ زمین اور سواری کے چند جانور تھے۔ سو ان کے متعلق بھی آپ اعلان فرما چکے تھے کہ "ہم انبیاء کا کوئی وارث نہیں ہوتا جو میں چھوڑوں وہ عام مسلمانوں کا حق ہے۔"

اور یہ ترکہ آپ نے اس وقت چھوڑا جب ملک حجاز کے علاوہ بعض باہر کے علاقے بھی اسلام کے زیر نگیں آچکے تھے۔ بڑے بڑے سلاطین اور اُمراء کے یہاں سے آپ کے دربار میں بیش بہا تحائف آتے رہتے تھے، اور صحابہ کرام تو ہر وقت جان و مال سے حاضر رہا ہی کرتے تھے۔

چوتھا مقالہ

وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا بِالْبَيِّنٰتِ

(اور ہمارے پیغمبر لوگوں کے پاس کھلی ہوئی نشانیاں لے کر آئے۔ القرآن: مائدہ)

معجزے ان مافوق العادت باتوں کو کہتے ہیں جو خدا کے حکم اور اس کی عنایت سے انبیار علیہم السلام سے صادر ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں بہت سے پیغمبروں کے معجزوں کا تذکرہ کیا گیا ہے اور دوسرے مذہبوں کی مقدس کتابوں میں بھی اس قسم کے بے شمار واقعات پائے جاتے ہیں ـــــ اور یہ کچھ انبیاء تک ہی محدود نہیں ہے۔ اللہ کے بعض دوسرے بندے بھی اس کی مرضی اور حکم سے وقتاً فوقتاً اسباب و علل کے کارخانوں پر غالب آتے رہتے ہیں۔

عام اصطلاح میں جو عجائب و خوارق انبیاء کے ہاتھوں ظاہر ہوتے ہیں ان کو معجزات اور جو اولیائے کرام سے صادر ہوتے ہیں ان کو کرامات کہتے ہیں مگر حقیقتاً یہ

لفظ 'معجزہ'، کا یہ استعمال زیادہ صحیح نہیں ہے، کیونکہ یہ جس مفہوم کا حامل ہے اس سے اس کے خود پیغمبر کا فعل ہونے کی غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں غالباً اسی لئے کہیں معجزہ کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا ہے اور اس کے بجائے 'آیت' (نشانی) اور 'برہان' (دلیل) کے الفاظ سے کام لیا گیا ہے۔

معجزہ اور سحر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ سحر ایک ہنر، ایک علم ہے جسے سیکھا اور سکھایا جا سکتا ہے۔ معجزہ کسب و اختیار کی چیز نہیں۔ جس طرح نبوت محض ایک عطیہ ربانی ہے معجزہ بھی کسی خیالی توجہ و تصرف یا "قوتِ بازو" سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ سحر طبعی و نفسی اسباب کا نتیجہ ہے۔ معجزہ براہ راست خدا کی مشیت اور قدرت پر منحصر ہے۔ اس کے علاوہ شعبدہ بازی کا مقصد محض تفنن طبع ہوتا ہے۔ اسی لئے ساحروں کا اخلاقی معیار بلند ہونا مطلق ضروری نہیں ہے اور نہ وہ اسکا دعوی ہی کرتے ہیں۔

کیا معجزے واقعی ممکن ہیں؟ اس کا ایک جواب تو یہ ہو سکتا ہے کہ اگر ممکن نہ ہوتے تو واقع کیونکر ہوتے، اور ان کے واقع ہونے کی بابت شک کیا جائے تو پھر اس انداز فکر کو معجزوں تک ہی کیوں محدود رکھا جائے اور تاریخ کے دوسرے واقعات کیوں مستثنیٰ کر دیئے جائیں۔ رہی یہ بات کہ ان واقعات کا ہونا سمجھ میں نہیں آتا تو جو چیز سمجھ میں نہ آتی ہو اسکی واقعیت سے انکار کر بیٹھنا یہ بھی تو تقاضائے عقل نہیں ہے۔ عقل انسانی بہر حال کوئی مطلق شے نہیں ہے۔ علامہ سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ:۔

"عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات و سوانح غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ، وہ کچھ دیکھتے تھے جو ہم نہیں دیکھ سکتے۔ وہ، وہ کچھ سنتے تھے جو ہم نہیں سن سکتے، وہ،

وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جان سکتے اور ان سے وہ اعمال صادر ہوتے تھے جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے، یہ تاریخی واقعات ہیں جن سے انکار کرنا اسی طرح ناممکن ہے جس طرح سکندر اور نپولین کے فتوحات اور بدھ اور موسیٰ علیہما السلام کے وجود سے [۱]۔"

خوارق کی منطقیانہ توجیہ و تعلیل پر بے شمار اوراق سیاہ کئے جا چکے ہیں۔ یونانی فلاسفہ سے لے کر ہیوم (HUME) ہیگل (HEGEL) ہکسلے (HUXLEY) اور ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) تک سبھی مفکروں نے اس بحث میں حصہ لیا ہے، جس کا خلاصہ بھی اس مختصر مقالے میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے۔ سیرۃ النبی کی تیسری جلد میں فلسفہ قدیم کے نظریات کی تشفی بخش تشریح کی گئی ہے اور جدید فلسفہ کے نظریات پر پروفیسر عبدالباری ندوی کا ایک مقالہ بھی اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ انیسویں صدی کے سب سے زیادہ مشہور ماہر نفسیات ولیم جیمس (WILLIAM JAMES) کی کتاب ورائیٹیز آف ریلیجس ایکسپیرینس" (VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE) بھی اس سلسلہ میں مطالعہ کے لائق ہے۔ معجزوں پر یقین آنے کی پہلی شرط خدا اور غیب پر یقین ہے۔ قدرت خداوندی پر ایمان لائے بغیر معجزوں کی صداقت کا دل نشین ہونا محال ہے اور ایمان لے آنے کے بعد کوئی چیز مانع یقین نہیں رہتی۔

انگلستان کے مشہور منطقی ولیم اسٹانلی جیونس [۳] نے ایک نہایت ضخیم کتاب اصول سائنس [۲]

---

[۱] سیرۃ النبی جلد سوم ص ۴ [۲] پرنسپلز آف سائنس (PRINCIPLES OF SCIENCE) [۳] (WILLIAM STANLEY JEVONS)

کے نام سے لکھی ہے۔ جس میں انھوں نے آخری نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:[۱]

"اوپر علم سائنس کی حقیقت و نوعیت کے متعلق جو بحثیں گذری ہیں ان سے ایک نتیجہ جو صاف طور پر نکلتا ہے وہ یہ ہے کہ ہم کارخانہ فطرت میں مداخلت خداوندی کے امکان کو کسی طرح باطل نہیں ٹھہرا سکتے۔۔۔۔ جس قدرت نے کائنات مادی کو خلق کیا وہ میرے نزدیک اس میں حذف و اضافہ بھی کر سکتی ہے۔ اس قسم کے واقعات ایک معنی کر کے ہمارے لئے ناقابلِ تصوّر کہے جا سکتے ہیں، پھر بھی یہ اس سے زیادہ ناقابل تصور نہیں جتنا کہ خود عالم کا وجود ہے۔"

گویا، دوسرے الفاظ میں، خالق فطرت خلاف فطرت بھی کر سکتا ہے اور کبھی کبھی اپنی شان کبریائی کا مشاہدہ کرانے کو ایسا کر بھی دیتا ہے۔ یہاں علل و معلولات، اسباب و مسبّبات کے سلسلہ سے انکار کرنا مقصود نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عام سنت و عادت یہی ہے کہ مسبّبات اسباب کے تابع ہوں لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ خود بھی اسباب کی منطق کا پابند ہو گیا ہے۔ سب سے اعلیٰ اور موثر سبب ربّ الارباب کا "ارادہ" اور "امر" ہے۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے ارشاد فرمایا ہے:۔

بیشتر احوال بر سنّت رود   گاہ قدرت خارقِ سنّت شود

سنت و عادت نہادہ با مزہ   باز کردہ خرق عادت معجزہ

بے سبب گر عز بما موصول نیست   قدرت از عزل سبب معزول نیست

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ جس کی طرف مولانا ابوالحسن علی ندوی نے "تاریخ دعوت

---

[۱] ماخوذ از سیرۃ النبی جلد سوم، ص ۳۰۲

وعزیمت" میں اشارہ کیا ہے یہ ہے کہ چونکہ انبیاء علیہم السلام کے زمانہ میں دنیا اسباب ظاہری میں الجھی ہوتی ہے اور خالق اسباب نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے اور سارا عالم ظواہر اور مظاہر پرستی میں گرفتار ہوتا ہے اسلئے انبیاء علیہم السلام اسباب پر ضرب لگاتے ہیں اور اسباب کے بجائے مسبّب کی طرف متوجہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے ہاتھوں سے بالکل خلافِ عادت واقعات ظاہر کر کے اور معجزے دکھا کے اسباب کی بے حقیقتی اور کمزوری نمایاں کرتا ہے[۱]۔

انبیاء در قطع اسباب آمدند　　معجزات خویش بر کیواں زدند

جملہ قرآن است در قطعِ سبب　　عزِ درویش و ہلاکِ بولہب

(۲)

یوں تو انبیاء کا سر تا پا وجود ہی ان کے منصب جلیل کی تصدیق کے لئے کافی ہوتا ہے، لیکن عام طور پر یہ خیال رائج ہے کہ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات نبوت کے ضروری اجزاء ہیں۔ اور نبی وہی شخص ہو سکتا ہے جو خدا کی طرف سے امور غیب کی اطلاع رکھتا ہو اور جس سے خوارق ظاہر ہوتے ہوں۔

چنانچہ اس قدیم عقیدہ کے ماتحت کہ انبیاء کے ساتھ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے، معجزے نبوت کی منطقی دلیل نہ سہی نفسیاتی دلیل بلاشبہ ہو جاتے ہیں۔

معجزے بذات خود نہ مقصود ہیں نہ مطلوب۔ انبیاء کا اصلی کام جمادات و نباتات پر تصرف کرنا نہیں، دلوں میں تبدیلی کرنا ہے۔ معجزوں کی حیثیت بس ایک ذریعہ کی ہے کہ وہ لوگوں کے قلوب کو خدا کی طرف موڑنے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

---

[۱] جلد اول صفحہ ۳۶۷

اگر غور کیا جائے تو انبیاء کی زندگیوں کا ہر باب خود ایک معجزہ نظر آئے گا۔ چنانچہ پیغمبر اسلام کا قریش کی پیہم سازشوں کے باوجود زندہ و سلامت رہ کر دین کی تبلیغ کرنا، اُمی ہونے کے باوجود قرآن مجید جیسے لاثانی علمی و ادبی شاہکار کا حامل ہونا، محدود وسائل کے باوجود دشمنوں کے عظیم الشان لشکروں پر میدان جنگ میں فتح پانا اور بالآخر تمام رکاوٹوں اور مخالفتوں پر غالب آکر اشاعت دین میں بے مثال کامیابی حاصل کرنا وغیرہ ۔ ان میں کون سی بات آپ کی ذات کی معجز نمائی پر دلالت نہیں کرتی مگر ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق سوچتا اور سمجھتا ہے۔ چنانچہ آپ کے اولین مخاطب قریش مکہ کی بڑی تعداد کا یہی حال تھا کہ ان سب چیزوں سے بھی ان کو اطمینان حاصل نہیں ہوا اور وہ برابر خوارق ہی کے لئے اصرار کرتے رہے۔

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ (یونس : ع ۲)	"اور وہ لوگ کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے اس پر کوئی نشان کیوں نہیں اترتا۔ اے پیغمبر کہدے کہ غیب کی بات خدا کے پاس ہے، تم اسکے ظہور کا انتظار کرو میں بھی تمھارے ساتھ منتظر ہوں۔"
وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ (الرعد ع ۴)	"اور کفار کہتے ہیں کہ اس پیغمبر پر اس کے خدا کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی۔"
وَقَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى تَفْجُرَ لَنَا مِنَ الْاَرْضِ يَنْبُوْعًا اَوْ تَكُوْنَ	"اور کہا انھوں نے کہ ہم نہ مانیں گے تمہاری بات جب تک کہ تم نہ نکالو ہمارے واسطے

لَكَ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيْلٍ وَّعِنَبٍ	زمین سے ایک چشمہ، یا ہو جائے تمہارے
فَتُفَجِّرَ الْاَنْهٰرَ خِلٰلَهَا تَفْجِيْرًا	واسطے ایک باغ کھجور اور انگور کا، پھر
اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا	جاری کرو تم اس کے بیچ میں نہریں۔ یا
كِسَفًا اَوْ تَاْتِيَ بِاللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ	گرا دو آسمان کو ہمارے اوپر ٹکڑے ٹکڑے
قَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل : ع ۱۰)	کر کے، جیسا کہ تم کہا کرتے ہو، یا لے آؤ اللہ
	اور فرشتوں کو ہمارے سامنے ضامن بنا کر۔"

بالآخر جب مشرکین مکہ اپنی ضد سے نہ ہٹے تو اتمام حجت کے لئے پروردگار نے اپنے نبی کے دستِ حق سے مختلف معجزے رونما کرائے۔

جنوبی ہند میں ایک مثل ہے کہ "سوئے ہوئے کو محض تالی بجا کر جگایا جا سکتا ہے، مگر جو بن کر سویا ہوا ہے تم ڈھول پیٹ کر بھی نہیں چونکا سکتے۔" یہی حال صدورِ معجزات کے بعد منکرینِ دین کا ہوا جن کے دلوں میں حق طلبی کا ذرا بھی مادّہ تھا ان کی چشمِ بصیرت روشن ہو گئی لیکن جو سراسر خود بینی اور خود نمائی کے باعث ہی آپ کو جھٹلاتے تھے، ان کے باطن نے کروٹ تک نہ لی۔

معجزہ طلب کرنے والوں میں پیش پیش اسی آخری قسم کے لوگ تھے جن کے بغض و عناد نے ان کی حق و باطل کی فطری تمیز کو فنا کر دیا تھا۔ اور جن کو بڑی سے بڑی علامت اور نشانی بھی شک و شبہ کے گرداب سے نکال نہیں سکتی تھی۔ وہ کبھی معجزوں کو اتفاقی امور کہتے اور کبھی سحر اور شعبدہ بازی بتلاتے تھے۔ ایک معجزہ ان کو دکھایا جاتا تو فوراً دوسرے کا تقاضا کرنے لگتے۔ اور کہتے کہ اس بار تو تشفی نہ ہو سکی لیکن اگر آئندہ پھر ایسا ہی ہو جائے تو ہم ضرور قائل ہو جائیں گے۔ ان کے جواب میں اللہ پاک اپنے نبی کو

نصیحت فرمایا کہ دو چار نہیں ان کے سامنے اگر مسلسل نشانیاں اترتی رہیں تو بھی ان کی زبانیں بند نہ ہونگی اور وہ حق کو نہ مانیں گے:

وَمَا تَاتِیْھِمْ مِنْ اٰیَةٍ مِنْ	"اور خدا کی نشانیوں سے کوئی نشانی
اٰیَاتِ رَبِّھِمْ اِلَّا کَانُوْا عَنْھَا	ان کے پاس نہیں آتی جس سے یہ منھ
مُعْرِضِیْنَ (الانعام ع ۱)	نہ پھیر لیتے ہوں۔"
وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَیْکَ کِتٰبًا فِیْ	"اے پیغمبر! اگر ہم تجھ پر ایسی کتاب بھی
فِیْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْہُ بِاَیْدِیْھِمْ	آسمان سے اتاریں جو اوراق میں لکھی ہو
لَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اِنْ ھٰذَآ	کہ وہ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو سکیں،
اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۝ (الانعام: ع ۱)	تو وہ جو کافر ہیں یہی کہیں گے کہ یہ ایک جادو کا کھیل ہے"
وَاِنْ یَّرَوْا کُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا	"اگر وہ لوگ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں تب
بِھَا۔ (الانعام: ع ۳)	بھی وہ ایمان نہ لائیں گے۔"

(۳)

آنحضرت صلعم کے معجزوں میں سے چند یہ ہیں۔ غلبۂ روم کی پیشین گوئی، بنونضیر کی سازش کی اطلاع، مہاجرین حبش کو بشارت، ابوسفیان اور عمیر کی آپ کو قتل کرنے کی سازش کی اطلاع، قبائل عرب کی شکست اور فتح مکہ کی پیشین گوئیاں، فتح بدر و خیبر و حنین کی پیشین گوئی، یہود کی دائمی نامرادی کا اعلان، روم کی قوت ٹوٹ جانے کی اطلاع خلفائے راشدین کے زمانہ کی لڑائیاں، اپنی وفات کی اطلاع، شرح صدر، معراج، شق القمر، شفائے امراض، گونگے کا بولنے لگنا، استجابت دعا، قلیل المقدار اشیاء میں کثیر برکت کا ظاہر ہونا، خالی مشکیزہ سے پانی کا اُبلنے لگنا، آپ کی انگلیوں سے پانی جاری

ہو جانا، ناخواندگی کے باعث یہود و نصاریٰ کی مذہبی کتابوں سے ناواقف ہونے کے باوجود ان کے علماء کے سوالات کا صحیح جواب دینا، نزولِ قرآن، ملائکہ سے گفتگو، رویائے صادقہ، ہندوستان میں اسلام پھیلنے کا مژدہ سنانا، یہاں نمونہ کے طور پر اطلاعِ غیب اور صدورِ خوارق کا ایک ایک واقعہ یعنی اول الذکر میں سے غلبۂ روم کی پیشین گوئی اور آخر الذکر میں سے معجزۂ شق القمر کے معجزہ کی کچھ تفصیل پیش کی جاتی ہے۔

ایک پچھلے مقالہ میں بتایا جا چکا ہے کہ طلوعِ اسلام کے وقت روم اور فارس یہی دو دنیا کی سب سے بڑی طاقتیں تھیں۔ ان میں برابر جنگیں ہوا کرتی تھیں۔ بعثتِ نبوی کے آٹھویں سال یعنی ۶۱۶ء میں ایرانیوں نے رومیوں کو اتنی زبردست شکست دی کہ ان کی طویل و عریض سلطنت کی دھجیاں اُڑ گئیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ رومیوں کا سورج اب ہمیشہ کے لئے غروب ہو جائے گا۔ ان کا اقبال بے شک اپنے انتہائی نقطۂ زوال کو پہنچ گیا تھا۔

رومی چونکہ مذہباً عیسائی تھے، اسلئے مسلمانوں کو ان سے ایک گونہ ہمدردی تھی۔ اور ان کی ضد میں مشرکینِ مکہ آتش پرست ایرانیوں کی طرفداری کرتے تھے چنانچہ جب جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کی آرزوؤں کے خلاف نکلا تو کفار بہت خوش ہوئے اور انھوں نے مسلمانوں کو طعنہ دیا کہ "جس طرح ہمارے آتش پرست بھائی تمھارے اہل کتاب رومیوں پر فتحمند ہوئے ہیں اگر تم بھی ہماری مقابلہ میں آئے تو مغلوب ہوگے"!

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کی حالت بڑی حسرتناک تھی۔ وہ گنتی کے چند آدمی تھے اور ہر طرف سے حق سے انکار کرنے والی آبادیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ کفار ان پر دن رات مشق ستم کیا کرتے تھے، ان کا کوئی ہمدرد اور معاون نہ تھا۔ کچھ امید تھی تو

رومیوں سے کہ شاید حضرت علیسیٰ کی تعلیم کبھی ان میں اپنا اثر دکھائے اور وہ سچائی اور نیکی کی اس نئی کرن کی حفاظت کے لئے آمادہ ہو جائیں۔ جو سرزمین عرب سے پھوٹی تھی چنانچہ رومیوں کی شکست سے مسلمانوں کو بہت تکلیف پہنچی۔ قریش کی طعنہ زنی نے زخم پر نمک کا کام کیا اور مسلمانوں کی رنجیدہ دلی اور افسردہ خاطری کو اور بھی مکمل کر دیا۔

عین اس حالت میں ماضی، حال اور مستقبل کا علم رکھنے والے نے اپنے نبی کے ذریعہ مسلمانوں کو یہ مژدہ سنایا:۔

غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۙ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ	"قریب کی سرزمین میں رومی مغلوب ہو گئے
وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ	ہیں۔ مگر مغلوب ہونے کے چند (تین سے نو) برسوں
فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ڛ لِلّٰهِ الْاَمْرُ مِنْ	کے اندر پھر غالب ہو جائیں گے۔ پہلے اور
قبل ومن بعد يَوْمَئِذٍ يَّفْرَحُ	پیچھے سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے۔
الْمُؤْمِنُوْنَ ۙ بِنَصْرِ اللّٰهِ (الروم ع ۱)	اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے۔"

پیشین گوئی کوئی بھی ہو اسے توجہ کا مستحق اسی وقت مانا جائے گا جب وہ قیاس و گمان کے دائرہ کے باہر کی چیز ہو۔ حالات و واقعات اس کے خلاف اشارہ کرتے ہوں ہر شخص اسے مستبعد سمجھے، کسی کو اس پر یقین نہ آئے اور اس سب کے باوجود وہ حقیقت بن کر سامنے آجائے، نہ کہ وہ پیشین گوئی جسے قرآن نے قدرت خداوندی اور صداقت نبوی کی ایک نشانی کے طور پر پیش کیا ہو۔ اسلئے یہاں فتح روم کی پیشین گوئی کے تاریخی پس منظر کا تھوڑا سا جائزہ لینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

۶۰۲ء میں فاکس نامی ایک فوجی سردار نے رومی شہنشاہ مارس اور اس کے خاندان کو قتل کر کے خود تخت شاہی پر قبضہ کر لیا تھا۔ عام دستور کے مطابق نئے شہنشاہ

نے اپنی تخت نشینی کی خسرو پرویز فرمانروائے ایران کو اطلاع کی اور اس کے دربار میں اپنا سفیر بھیجا، لیکن خسرو نے نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ سفیر کو قید کرا دیا اور ۶۰۳ء میں روم پر حملہ آور ہو کر آناً فاناً دریائے فرات کو عبور کر کے شام کے شہروں پر قبضہ کر لیا۔

رومیوں کے پاس اعلیٰ فوجی افسروں کی بہت کمی تھی۔ مارسیس ان کا بہترین فوجی قائد تھا، مگر اسے فاکس نے تخت نشین ہوتے ہی قسطنطنیہ کے بازار میں زندہ جلا کر ختم کر دیا تھا۔ فاکس خود ایک معمولی قابلیت کا آدمی تھا، چنانچہ ایرانیوں کو روکنے میں ناکام رہے، اور وہ شام کے بعد بازنطینی سلطنت کا مشرقی دارالخلافت انطاکیہ فتح کرتے ہوئے ارض مقدس کے ایک ایک شہر پر قابض ہو گئے۔ یروشلم کے کلیسے نذر آتش کئے گئے۔ مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ اور یہودیوں کی اعانت سے ساٹھ ہزار بے گناہ عیسائی قتل کر ڈالے گئے۔

یہ قیامت خیز واقعات ہو ہی رہے تھے کہ رومی افریقیہ کے گورنر ہرقل نے فاکس کے خلاف بغاوت کی اور ۶۱۰ء میں اس کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

ادھر ایرانیوں کا لشکر مصر پر چھا گیا اور حبش و طرابلس کو زیر و زبر کرتا ہوا صحرائے لیبیا کے راستے سے واپس لوٹا، ایرانی افواج کا دوسرا بازو ایشیائے کوچک کو روندتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کے رکا اور شہنشاہ روم کا دارالسلطنت قسطنطنیہ ہر طرف سے اس کی لپیٹ میں آ گیا۔

ایرانی سیلاب جدھر سے ہو کر گزرتا گرجاؤں اور کلیساؤں کو بہائے جاتا۔ ان کی جگہ آتش کدے تعمیر ہو جاتے اور حضرت عیسیٰ کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کے قوانین نافذ کر دئیے جاتے۔

۶۱۶ء تک رومی پوری طرح مغلوب ہو گئے تھے اور علاوہ ان عظیم الشان علاقوں کے جوان کے ہاتھ سے نکل گئے تھے، سلطنت روما کی یورپین شاخ میں بھی غدر مچا ہوا تھا۔ انگلستان اور فرانس وغیرہ چھٹی صدی کے اختتام ہی پر خود مختاری کا اعلان کر چکے تھے۔ آسٹریا سے لے کر تھریس کی دیواروں تک آداریوں نے قتل و غارت کا بازار گرم کر رکھا تھا اور لومبارڈ گوتھ اور رونڈال کے لگاتار حملے ہو رہے تھے۔

اس ابتری کا ذکر کرتے ہوئے رومیوں کے عظیم المرتبت مورخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) نے لکھا ہے کہ رومی سلطنت کی مثال اس شاندار درخت کی سی تھی جس کے سایہ میں ایک وقت تمام اقوام عالم آباد تھیں، مگر اس پر ایسی خزاں آئی کہ برگ و بار کے ساتھ اسکی شاخیں اور ٹہنیاں بھی رخصت ہو گئیں۔ اب صرف تنا رہ گیا تھا اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا۔ خود پایۂ تخت کے اندر غنیم کے گھس آنے کا ایسا خوف تمام آبادی پر چھایا ہوا تھا کہ تقریباً کل کاروبار بند ہو گئے تھے۔ وہ بازار اور تماشہ گاہیں جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب ویران اور سنسان پڑی تھیں اور عیش پرستی کا یہ عالم تھا کہ لوگ ایک عرصہ سے تاہل کے بجائے تجرد کی زندگی بسر کرتے تھے، تاکہ آزادی اور آسانی کے ساتھ اپنے شہوانی جذبات کی تشفی کر سکیں[۱]۔"

خود ہرقل (HERACLIUS) کو شاہد و مینا سے فرصت نہ تھی۔ ان حالات میں قسطنطنیہ ایرانی محاصرہ کا کیا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مجبوراً رومیوں کی طرف سے صلح کی تحریک ہوئی۔ رومۃ الکبریٰ کے زوال کا اندازہ اس واقعہ سے بھی ہو سکتا ہے کہ جب رومی عہدیدار ایرانی دربار میں امن و عفو کی درخواست لے کر گئے تو خسروئے ایران نے بڑی حقارت سے

---

[۱] ایڈورڈ گبن، جلد ۲، صفحہ ۳۷۲ (GIBBON, OP. CIT, VOL. II P.372)

کہا کہ "مجھ کو یہ نہیں بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیئے"۔
میں اس وقت تک صلح نہیں کروں گا جب تک شہنشاہ روم اپنے مصلوب خدا کو
چھوڑ کر ہمارے سورج دیوتا کے آگے سر نہ جھکا دے"۔

آخر کار ایرانی سپہ سالار نے صلح کی شرطیں پیش کیں اور کثیر المقدار سونے اور چاندی
کے علاوہ ایک ہزار کنواری لڑکیوں کا بھی مطالبہ کیا۔ اور رومیوں نے یہ سب منظور کر لیا۔

درحقیقت اس وقت ایرانیوں کی طاقت کا یہ عالم تھا کہ اگر انکے پاس بحری بیڑہ
بھی ہوتا تو وہ آسانی سے پورا یورپ فتح کر سکتے تھے۔

یہ تھی حالت کہ جس میں ۶۱۶ء میں قرآن کی پیشین گوئی نازل ہوئی تھی۔ چنانچہ
کفار مکہ نے اس کا استقبال خندۂ تحقیر سے کیا اور اسکے خلاف بھاری بھاری شرطیں لگائیں[۱]۔

یکبارگی ہرقل کی زندگی میں انقلاب رونما ہوا اور عیش پرستی، کاہلی اور پست حوصلگی
کی جگہ جواں ہمتی، بیدار مغزی اور اعلیٰ فوجی صلاحیتوں نے لے لی۔ اس تبدیلی کی بابت
گبن نے لکھا ہے کہ "وہ شہنشاہ جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی، عیاشی اور
اوہام کا غلام اور اپنی رعایا کے مصائب کا نامراد تماشائی تھا، جس طرح صبح و شام کا کہر دوپہر
کے آفتاب سے پھٹ جاتا ہے، دفعتہً محلوں کا ارکاڈیوس میدان جنگ کا سیزر بن گیا[۲]۔

کہاں مصیبتوں اور ناامیدیوں سے گھبرا کر وہ قسطنطنیہ کو خیرباد کہنے کا ارادہ کر
رہا تھا کہاں اس نے سینٹ سوفیا میں جا کے قسم کھائی کہ رومیوں کی کھوئی ہوئی عظمت
کو دوبارہ حاصل کرنے میں زندگی اور موت کی بازی لگا دے گا۔

قسطنطنیہ میں بڑے عزم و انہماک سے جنگی تیاریاں شروع ہوئیں اور ۶۲۱ء

---

[۱] جامع ترمذی [۲] گبن، جلد ۲، ص ۳۰۴

میں ہرقل اپنی فوجیں لے کر ایرانیوں سے بدلہ لینے روانہ ہوا جس وقت یہ لشکر قسطنطیہ سے نکلا لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومۃ الکبریٰ کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے[۱]۔ مگر قرآن کی پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اور رومیوں نے مقبوضات کا ایک ایک شہر واپس لے لیا۔

ہرقل نے ایشیائے کوچک کے مغربی، جنوبی ساحل کو بائیں طرف چھوڑتے ہوئے خلیج اسکندرونہ میں اپنی فوجیں اتاریں اور بندرگاہوں کے قلعوں کی مرمت کرائی، پھر وہ سلیشیا میں داخل ہوا اور اس کو فتح کرنے کے بعد کے پے ڈوشیا کا رُخ کیا اور اس سے گزرتا ہوا بحر اسود اور آرمینیا کے پہاڑوں کو عبور کرتا ہوا قلب ایران میں گھس گیا اور رومی فوجوں کا دوسرا دستہ طورس فتح کرتا اور ایرانیوں کے آتشکدے سرد اور خسرو کی مورتیں نذر آتش کرتا ہوا گندزا کا اور موگان کے علاقوں تک پہنچ گیا۔

ایرانیوں کی سلطنت اس دوطرفہ حملہ سے خطرہ میں پڑ گئی۔ انھوں نے گھبرا کے وادیٔ نیل اور باسفورس سے فوجیں طلب کیں مگر ہرقل نے اس لشکر جرار کو بھی شکست دی اور قزوین اور اصفہان کے شہروں کو روندتا ہوا کردستان کے پہاڑی سلسلہ کے اوپر سے گذرا اور دجلہ عبور کر کے ایرانیوں سے ایک اور خونیں جنگ لڑی اور ان کو پسپا کر کے ساباط میں داخل ہو گیا۔

آخری اور فیصلہ کن معرکہ نینوا کے میدان میں ہوا جس میں ایرانیوں نے ایسی شکست کھائی کہ ان کی سلطنت زیر و زبر ہو گئی اور رومیوں نے اپنی قدیم تاریخی حدود سے نکل کر سلطنت فارس کے قلب میں اپنا جھنڈا نصب کر دیا۔

اس طرح ۶۲۵ء میں یعنی قرآن کی پیشین گوئی کے ٹھیک نو برس بعد ہرقل فاتحانہ

---

[۱] گبن جلد ۲۔ صفحہ ۲۰۴

قسطنطنیہ واپس آیا۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ محمد (صلعم) نے ایرانی فتوحات کے عین شباب میں پیشین گوئی کی کہ چند سال کے اندر رومی جھنڈے دوبارہ فتح کے ساتھ بلند ہوں گے۔ جب یہ پیشین گوئی کی گئی تھی اس سے زیادہ بعید از قیاس کوئی بات معلوم نہیں ہوتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال سلطنت روما کی عنقریب تباہی اور خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے۔"

اس مہم کی تکمیل کے بعد ہرقل پھر اپنے پرانے مشاغل شراب نوشی اور عیش پرستی کی طرف لوٹ گیا اور ویسا ہی ہو گیا جیسا کہ وہ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں تھا۔ تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ اسکی زندگی کا بہترین اور سب سے زیادہ شاندار دور وہ تھا جس میں اس نے ایرانیوں سے بدلہ لیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے صرف اپنی پیشین گوئی کو پورا کرانے کے لئے اسے بیدار کر دیا تھا۔

مورّخ ہرقل کی زندگی کا معمّہ سلجھانے سے قاصر ہیں اور ان کا فیصلہ ہے کہ ہرقل کے لئے کہیں زیادہ اچھا ہوتا کہ وہ ۶۲۵ء ہی میں مرجاتا۔

انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA) کی گیارھویں جلد میں مرقوم ہے کہ :۔

"ہرقل کا کردار ایک عجیب معمّہ ہے جس کا سلجھانا آسان نہیں ہے۔ ایک بہادر اور ہوشیار سپہ سالار اور تجربہ کار مدبّر ہونے کے باوجود وہ نہایت سکون اور اطمینان کے ساتھ اپنی سلطنت کو پرزے پرزے ہوتے ہوئے دیکھا کیا۔ زندگی کے مختلف دوروں میں اسکی

حیثیتیں اور صلاحیتیں نہ صرف ایک دوسرے کے مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں. لیکن یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ اس کی خانگی زندگی کے متعلق ہماری معلومات بہت ناقص ہیں، ممکن ہے کہ اس تضاد کا کوئی واقعی سبب ہو، اگرچہ اس کے عمل کے لئے وہ صحیح عذر قرار نہیں دیا جا سکتا ہے. اسکی شہرت کی بقا کے لئے یہ بہتر ہوتا کہ وہ ایرانی مقابلہ کے فوراً بعد مر جاتا۔"

معجزۂ شق القمر آنحضرت صلعم کی مکی زندگی کے اواخر میں رونما ہوا تھا۔ صحابہ میں سے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر، انس بن مالک، جبیر بن مطعم وغیرہ نے اس واقعہ کی روایت کی ہے.

قاضی سلیمان منصور پوری کا بیان ہے کہ آنحضرت صلعم سے چاند کو شق کرنے کا مطالبہ قریش مکہ نے یہود کے مشورہ پر کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی طرف یہودیوں کا خیال حضرت موسیٰ کے سب سے بڑے معجزے فلق بحر کی وجہ سے گیا ہو[1]

حضرت عبداللہ بن مسعود کا اس واقعہ کا چشم دید بیان جو صحیح بخاری و مسلم و ترمذی وغیرہ میں مذکور ہے، یہ ہے:۔

"ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ منیٰ میں تھے کہ چاند پھٹ گیا اور اس کا ایک ٹکڑا پہاڑ کی طرف چلا گیا۔ آپ نے فرمایا گواہ رہنا۔"

حضرت انس بن مالک کی یہ روایت بخاری و مسلم دونوں میں ہے کہ:۔

"اہل مکہ نے نبی صلعم سے مطالبہ کیا تھا کہ ان کو کوئی بڑا معجزہ دکھایا

---

[1] رحمۃ للعالمین جلد سوم، صفحہ ۱۸۶

جائے۔ نبی نے ان کو چاند کا پھٹنا دکھایا۔ اسکے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک ٹکڑا کوہِ حرا کے اُس طرف تھا اور دوسرا اس طرف"۔

اور جبیر بن مطعم کا بیان ہے کہ اس معجزے کو دیکھ کر قریش نے کہا کہ "محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے۔ اس پر کچھ لوگ بولے کہ اگر محمد نے ہم پر جادو کر دیا ہے تو وہ تمام آدمیوں پر تو جادو نہیں کر سکتے۔ مسافروں کو اور مقامات سے آنے دو۔ دیکھو وہ کیا کہتے ہیں چنانچہ جب مختلف مقامات سے مسافر آئے تو انھوں نے بھی اپنا یہی مشاہدہ بیان کیا ہے"۔

قرآن مجید میں اس واقعہ کے بارہ میں اجمالاً صرف اتنا فرمایا گیا ہے۔

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ	"قیامت نزدیک آگئی اور چاند شق ہو گیا
الْقَمَرُ ه وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً	اگر کافر کوئی بھی نشانی دیکھیں تو وہ اس سے
يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ	انکار ہی کریں گے اور کہیں گے کہ یہ تو جادو
مُّسْتَمِرٌّ ه (القمر: ع ۱)	ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے"۔

یہ معجزہ ابتدا سے دقیق فلسفیانہ بحثوں کا موضوع رہا ہے۔ قدما کو یہ اعتراض تھا کہ اجرامِ فلکی میں شکست و ریخت ناممکن ہے، اسلئے چاند کا شق ہونا بھی محال ہے۔ مگر جدید انکشافات نے فلکیات کے تصوروں میں بہت زیادہ تبدیلی کر دی ہے۔ اور چند صدیوں قبل جو باتیں محال سمجھی جاتی تھیں آج ان کو سن کر تعلیمیافتہ دنیا کی جبین پر کوئی شکن نہیں پڑتی ہے۔ ایمونیل ولیکافسکی (IMMANUEL VELIKOVSKY) نے "ورلڈز ان کولائژن" (WORLDS IN COLLISION) کے نام سے اجرام فلکی کے سنن و عادات پر ایک بے نظیر کتاب لکھی ہے جس میں تاریخی حوالوں کے ساتھ بڑے بڑے اجرام کے شکست و ریخت و تصادم کے متعدد حادثوں کا ذکر کیا ہے، حتیٰ کہ سورج کے رخ

بدلنے کے کم از کم ایک واقعہ کو بھی عین ممکن بتایا ہے۔

بعض معترضین کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر ایسی عجیب بات واقع ہوتی تو صرف اہلِ مکہ ہی کو نہیں، ساری دنیا کو نظر آتی مگر چاند دنیا کے تمام حصوں میں بیک وقت نظر نہیں آتا ہے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے بڑی محنت سے وقت کا ایک نقشہ تیار کیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ اگر عرب میں رات کے نو بجے ہوں تو دنیا کے دوسرے ملکوں میں کیا وقت ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندستان، برما، ملایا، ترکی، یونان، فرانس، انگلستان، اسپین، پرتگال، امریکا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ وغیرہ میں بارہ بجے رات سے لیکر سہ پہر تک مختلف اوقات ہوں گے، چنانچہ دنیا کا بہت بڑا حصّہ اس منظر کو دیکھنے سے قدرتی طور پر معذور تھا۔ اور جہاں طلوعِ ماہتاب سے لے کر نصف شب تک کا وقت تھا وہاں اکثر لوگ سو رہے ہوں گے یا اپنے گھروں میں بند ہوں گے۔ اور جنھوں نے دیکھا بھی ہوگا ان میں بہت بڑی تعداد ایسوں کی ہوگی جو ناخواندگی کے باعث اپنے مشاہدات کو تحریری صورت میں لانے کی قدرت نہ رکھتے ہوں گے، پھر جو چند پڑھے لکھے تھے بھی ان کے لئے ضروری تو تھا نہیں کہ اس مشاہدہ کو قلمبند کر لیتے، اور اگر دو چار نے اپنی یادداشتوں کو لکھ بھی لیا ہوگا تو ممکن ہے، کہ ان کی یادداشتیں سیکڑوں دوسرے مسودوں کی طرح ضائع ہو گئی ہوں۔

دنیا میں لاتعداد فلکی انقلابات ظاہر ہوئے ہوں گے لیکن ان میں سے کتنے علمِ ہیئت کی کتابوں میں پائے جاتے ہیں؟ تو کیا ان کا درج نہ ہونا عدمِ وقوع کی دلیل ہے؟ مثلاً انجیل میں سطر ملتی ہے کہ قریب دن بھر کے سورج پچھم کی طرف مائل نہ ہوا[۱] اور یہودی اور عیسائی دونوں اس کی صحت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اب کیا کوئی ایماندار

---

[۱] کتاب یشوع ۱۰/۱۲

شخص محض اس بناپر اسکو جھٹلا سکتا ہے کہ قدیم کتابوں میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا ہے کہ کرۂ ارض بارہ گھنٹے کے لئے ساکن ہو گیا ہو؟

علامہ سید سلیمان ندوی کے نزدیک اس میں ایک پہلو اور بھی ہے، وہ فرماتے ہیں:۔

"چونکہ اللہ نے یہ نشانی محض اہلِ مکّہ کے لئے ظاہر کی تھی، اس لئے تمام دنیا میں اسکے ظہور و رویت کی حاجت نہ تھی، اور اس بناپر اگر بالفرض دنیا کے دوسرے حصوں میں چاند کو شق ہوتے ہوئے نہ دیکھا گیا ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہ تھی بلکہ مکہ کے علاوہ دوسرے شہروں اور ملکوں میں اس کا نظر نہ آنا ہی مصلحتِ الٰہی تھی، کیونکہ اگر یہ دنیا بھر کے لوگوں کو عام طور سے نظر آتا تو یہ سمجھا جاسکتا تھا کہ یہ بھی آسمان کے طبعی انقلابات میں سے ایک انقلاب تھا۔ اور عام فلکی تغیرات سے زیادہ حیثیت نہ رکھتا تھا۔ مگر جب اہل مکہ کے علاوہ جو اور لوگ شہر مکہ میں تھے یا باہر سفر میں تھے صرف ان ہی کو نظر آیا تو اس بات کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ یہ صرف آنحضرتؐ صلعم کے ایک نشان کے طور پر ظاہر ہوا تھا"[1]

بہر حال جیسا کہ ہم پہلے کہہ آئے ہیں، معجزات پر یقین کرنے کی پہلی شرط خدا اور غیب پر یقین ہے، اسی کے ساتھ یہ سوال بھی وابستہ ہے کہ اس سارے کارخانہ فطرت کی بنیاد کوئی بے شعور و بے ارادہ مادّہ ہے یا یہاں جو کچھ بھی ہوتا ہے وہ تمام تر و براہ راست کسی علم و ارادہ والی ذات کی مشیت و قدرت کا ظہور ہے؟ جدید علم الطبیعات (PHYSICS) نے مادّہ کے پرانے نظریہ کو ایک دم غلط ثابت کر دیا ہے، اب ازلی و غیر فانی مادّہ کے نام کی کوئی چیز تسلیم نہیں کی جاتی ہے۔ جیسے انیسویں صدی کی سائنس ایک اٹل حقیقت

---

[1] سیرت النبی جلد سوم صفحہ ۵۶۷

سمجھتی تھی وہ اب بیسویں صدی کے سائنس دانوں کی نظر میں ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

برقیات کے انکشاف نے مادّہ کی اساسی حقیقت کا قلع قمع کر ڈالا ہے۔ لیکن خود برقیات کی انتہائی حقیقت کیا ہے، یہ کسی کو نہیں معلوم، حیرت کی اس منزل پر پہنچ کر کم از کم سائنسداں فلسفیوں کا رجحان روز بروز تصوریت کی جانب بڑھتا جارہا ہے۔ وہ کائنات کا اساسی سرچشمہ شعور کو قرار دینے لگے ہیں۔ گویا کہ مادّی کائنات کی تخلیق و تنظیم کسی بے حس و بے جان شے کے میکانیکی عمل کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس کے پیچھے ایک ذہن و شعور ہے۔ اس طرح جب ساری کائنات ہی ایک ذی علم و ذی شعور اساسی سرچشمہ سے ماخوذ ہے تو معجزوں کی مادی و میکانیکی تشریح کی خواہش دراصل ایک جاہلانہ خواہش ہے۔ خود مادّہ کو غیر مادی و غیر جوہری تسلیم کر لینے کے بعد بھی مادہ پرست ذہنیت کا شکار رہنا اور اس کی بنا پر خدا اور مذہب اور نبوت کا انکار کرنا کونسی عقلمندی ہے؟

پانچواں مقالہ

خُلقِ عظیم

اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيمٍ

(بے شک تم اخلاق کے بڑے درجہ پر ہو)

انسان معاشرہ میں پیدا ہوتا ہے اور اسی میں جیتا اور مرتا ہے۔ ارسطو نے اسے ایک "معاشرتی جانور" کہا ہے۔ ماں کے آغوش سے لیکر لحد کے آغوش تک اس کی زندگی معاشرہ کے مختلف علاقوں اور رابطوں میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان علاقوں اور رابطوں کی اسے ہر وقت ضرورت ہے۔ یہ اس کی بشریت کے اجزاء ہیں۔ ان کو توڑ کر وہ ایک انسان کی طرح زندگی نہیں بسر کر سکتا ہے۔ ارسطو ہی کا قول ہے کہ "جسے معاشرہ کی حاجت نہ ہو وہ یا خدا ہے یا درندہ، انسان نہیں۔"

ہماری اس خصوصیت نے ہمارے وجود کے گرد حقوق و فرائض کا ایک وسیع

جال بن رہا ہے۔ ہم پر ہمارے گھر کے حقوق ہیں، ہمارے محلہ کے حقوق ہیں، ہمارے شہر ہمارے ملک اور کل دنیا کے حقوق ہیں اور ان سب پر ہمارا حق ہے۔ جو شخص ان حقوق اور ذمہ داریوں کو برتنے میں جتنا زیادہ کامیاب ہو اسے اتنا ہی زیادہ شریف، شائستہ اور معیاری شہری سمجھا جاتا ہے۔

ایک فرد اور دوسرے فرد یا افراد اور معاشرہ کے رشتوں اور تعلقات کے عدل و انصاف اور ہمدردی اور سلامتی کی بنیادوں پر رکھنے کے لئے دو چیزیں ہیں، قانون اور اخلاق، ہماری نجی اور اجتماعی زندگی کی عافیت اور اس کے صاف ستھرے پن کا انحصار انھیں پر ہے۔

دنیا کے سارے مذہبوں نے اپنی بنیاد اخلاق پر رکھی ہے۔ اسلام نے تو ایک طور پر اخلاق کی اہمیت کو عبادت سے بھی بڑھا دیا ہے اور جب کہ کفر و شرک کے علاوہ ہر گناہ خدا کے نزدیک معافی کے قابل قرار دیا ہے، باہم انسانوں کے اخلاقی فرائض کی کوتاہی کی معافی ان بندوں کے ہاتھ میں رکھی ہے۔ جن کے حق میں وہ ظلم ہوا ہو۔

اسلام اخلاق حسنہ کو ایمان کی پہچان اور اسکے نتائج و ثمرات بتاتا ہے۔ جن مسلمانوں کے اخلاق جتنے اچھے ہوں اتنا ہی اس کا ایمان مضبوط اور اسکی عبادت مقبول ہوگی۔ اگر کوئی شخص ایمان کا دعویدار ہو اور خدا کی عبادت کا بھی اہتمام رکھتا ہو مگر اخلاق کی دولت سے محروم ہو اور اہل و عیال، اعزاء و اقربا، دوست و احباب، پڑوسی، اہلِ وطن اور ساری انسانی برادری حتیٰ کہ جانوروں تک سے جو اس کا تعلق ہے اسے بحسن و خوبی انجام نہ دیتا ہو تو یہ عملی ثبوت اس بات کا ہوگا کہ اس کا ایمان، اس کی زبان سے اتر کر اس کے نفس کی گہرائیوں تک نہیں پہنچا ہے۔ گویا کہ ہمارے

اخلاق ہماری ایمانی حالت کی کسوٹی ہیں۔ ہم اپنے اخلاق کے آئینہ میں اپنی روح کا عکس دیکھ سکتے ہیں۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں اس طرح کے مضامین بکثرت آئے ہیں:۔

"مسلمانوں میں کامل ایمان اسکا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہو۔"

"اللہ کے بندوں میں اللہ کا سب سے پیارا بندہ وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔"

"لوگوں کو قدرتِ الٰہی کی طرف سے جو چیزیں عطا ہوئی ہیں ان میں سب سے بہتر اچھے اخلاق ہیں۔"

"تم میں میرے سب سے پیارے اور مجھ سے سب سے قریب وہ ہیں جو تم میں خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں بد اخلاق ہوں۔"

"جس کی نماز اس کو برائی اور بدی سے باز نہ رکھے اس کی نماز نماز ہی نہیں۔"

"میں حسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔"

"اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔"

حسنِ اخلاق کے پایہ اور مرتبہ کا اندازہ اوپر کی ان احادیث سے ہوگیا ہوگا۔ اچھے اخلاق ایمان کے لوازم ہی نہیں بلکہ وہ انسان کو ان بلندیوں تک بھی پہنچا دیتے ہیں جن تک وہ کثرتِ عبادت کے ذریعہ پہنچ سکتا ہے۔ ارشادِ نبوی ہے:۔

"انسان حسنِ خُلق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور

رات بھر نماز پڑھنے سے ملتا ہے"۔

"قیامت کے ترازو میں حسنِ خلق سے زیادہ بھاری اور چیز نہ ہوگی"۔

"اچھے اخلاق والا دنیا و آخرت کی نیکیاں لے گیا"۔

آنحضرت صلعم کے عہد مبارک میں دو صحابی بیویاں تھیں۔ ایک دن بھر روزہ رکھتیں اور رات بھر عبادت کرتیں، صدقہ دیتیں، مگر زبان دراز ایسی تھیں کہ پڑوسیوں کے دل چھلنی کئے رہتیں۔ دوسری بیوی صرف فرض نماز پڑھتیں اور غریبوں کو کپڑے بانٹ دیا کرتیں مگر ایذا ان سے کسی کو نہ پہنچتی، حضور سے ان دونوں کی بابت پوچھا گیا تو آپ نے پہلی کی بابت فرمایا کہ اس میں کوئی نیکی نہیں، وہ اپنی بد خلقی کی سزا بھگتے گی اور دوسری کی بابت فرمایا کہ وہ جنتی ہوگی۔

اسلام کی دوسری تعلیمات کی طرح اس کی اخلاقی تعلیم بھی حیرت انگیز طریقہ پر جامع اور مکمل ہے اور دوسری صفت اس کی یہ ہے کہ اسلام نے اخلاق حسنہ کی غرض و غایت تمام تر خدا کی خوشنودی ٹھہرائی ہے، اس طرح اچھے اور پاکیزہ اخلاقی خصائل و افعال کی نوعیت بھی عبادت کی ہو جاتی ہے اور وہ ہر قسم کی دنیوی، نفسانی اور ذاتی اغراض سے بلند ہو جاتے ہیں۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اچھے اور برے کاموں کا مدار نیت یعنی قلبی ارادہ یا کیفیت پر ہے۔ نتیجہ اتنی اہم چیز نہیں ہے۔ ذاتی نفع، ریاکاری، نمائش، فخر، لالچ، خوشامد اور اس قبیل کے دوسرے محرکات اگر کسی بظاہر اچھے سے اچھے کام کے پیچھے ہوں تو اس میں کوئی خوبی نہ رہے گی، نہ اللہ کی نظر میں اور نہ ہماری آپ کی نظروں میں —— اور اللہ کی نظر میں تو نیکی سے وہ کام بھی جو انسان اپنے ضمیر کی تسکین یا روحانی مسرت یا وجدان یا افادۂ عام کی غرض سے انجام دے اور

اس کے حکم کی حیثیت اور آخرت کے اجر و ثواب کی نیت اس میں ملحوظ نہ رکھے، بے وقعت اور بے قیمت ہی رہیں گے۔

انسانی فطرت کی رنگارنگی، طبائع کا تنوع اور ایک واقعہ یا حالات سے مختلف لوگوں کے متاثر ہونے کی کیفیات میں جو اختلاف ملتا ہے اس کا اقتضایہ ہے، کہ ہمارا نظام اخلاق ایسا متوازن اور معتدل ہو کہ اس میں نرم و گرم، جمالی و جلالی دونوں قسم کی قوتوں کا مناسب امتزاج پایا جاتا ہو۔ وہ طاقت اور سختی کا بھی مظہر ہو، صلابت رکھتا ہو تو دوسری طرف ماں کے دل کا گداز بھی۔ وہ طاقت اور سختی کا بھی مظہر ہو اور مسکنت اور عاجزی کا بھی۔ کوہ گراں بھی ہو اور آب رواں بھی، شعلہ بھی ہو اور شبنم بھی نہ وہ شروع سے آخر تک مسیحیت کی انفعالیت اور عاجزی ہی کی تشریح ہو اور نہ شریعت موسوی کی قانونیت اور سختی ہی کی توضیح، بلکہ ان دونوں کو اپنے آغوش میں لے کر ایک ایسا توسط اور توازن پیدا کرے کہ امن و عدل، بلند ہمتی و استقلال، قوت و حرکت، آزادی و حق گوئی، عزم و وقار، عاجزی و فروتنی، رحم و عفو، حلم و بردباری صبر و سکون، رفاقت و محبت، استغنار، قناعت، توکل، سخاوت، عصمت، حیا، شجاعت مردانگی، سیر چشمی، بلند نظری، غرض تمام انسانی اوصاف اس میں نمایاں ہوں۔ جو غضب و شہوت کی قوتوں کا استیصال نہ کرے، کیونکہ اس طرح یہ دنیا ایک وسیع قبرستان ہو کر رہ جائے گی۔ اور نہ ان کو ہواہی دے کہ ہم سب درندوں کی سطح پر اتر آئیں، بلکہ ان کی صحیح تربیت کا انتظام کرے اور انھیں افراط و تفریط کا شکار نہ ہونے دے۔ پیروانِ مسیحیت نے غضبی و شہوانی قوتوں کو بنفسہٖ برقرار رکھکر ایک بڑی غلطی کی ہے۔ نطشے (NIETZSCHE) نے اسی لئے مسیحی فلسفۂ اخلاق

سے منھ پھیر لیا تھا۔ جب تک پروٹسٹنزم نے اس رہبانی اخلاقیت کے خلاف بغاوت کر کے نفس کے ان اجزاء کو تمدن اور اخلاق میں مناسب جگہ نہ دی یورپ کے ذہن پر ایک طرح کا جمود چھایا رہا۔ ان قوتوں میں بذات خود کوئی برائی نہیں ہے۔ دراصل ان ہی سے شجاعت، حوصلہ مندی، استقلال، پامردی، محبت اور دوسری اچھائیاں ابھرتی ہیں جن کے بغیر ہماری زندگی پھیکی اور بدمزہ ہی نہیں، بلکہ دنیا کے قریب قریب سارے اونچے اصول بے جان کے قالب بن جائیں گے۔ برائی ان کے غلط استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ ضرورت ان کے استعمال کا صحیح موقع اور محل مقرر کرنے کی ہے، اور ان راستوں کے تعین کی جن میں بہہ کر حیات و قوت کے یہ دھارے معاشرہ کی شادابی اور نکھار کا سبب بن سکتے ہیں۔ ان کو خشک کرنے کی نہیں، کیونکہ ان کے خشک ہونے سے تہذیب مرجھا جائے گی اور دنیا ویران ہو جائے گی۔ اسلام کی اخلاقی تعلیم کا یہی منشا ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

دوسری خصوصیت اسلامی تعلیم کی اس کی ہمہ گیری اور تمام اچھائیوں اور برائیوں کے سارے جزئیات کی احاطہ بندی ہے جبکہ دوسرے اخلاقی معلموں نے اپنی ہدایتیں صرف ایک قوم یا ایک زمانہ کی اصلاح تک محدود رکھیں، اسلام کے پیغمبر نے کل قوموں اور کل زمانوں کے حالات ملحوظ رکھ کر اخلاقی اصلاحات کی فہرست مرتب کی، سارے محاسن اور مفاسد کھول کر بیان کئے، ایک کا حکم دیا، دوسرے سے منع کیا، یہاں تک کہ اخلاقی اور نفسیاتی کیفیتوں اور حالتوں کا کوئی گوشہ توجہ اور ہدایت کا محتاج نہیں رہا ــــ جیسا کہ علامہ سید سلیمان ندویؒ نے لکھا ہے "اسلام نے اپنے اصول و احکام کی تفصیل اس وسعت اور جامعیت کے ساتھ کی ہے کہ برائیوں کا کلی استیصال ہو گیا ہے اور نیکیوں

کے مظاہر عام ہو گئے ہیں۔ اسکے بر خلاف دوسرے مذاہب نے ان کلیات کے جزئیات کی نہایت نامکمل اجمالی تشریح کی ہے[1]۔"

اسلامی اخلاقیات کی ایک اور خوبی جو اسے دوسرے مکاتب اخلاق پر فوقیت دیتی ہے اس کے معلمِ اخلاق کا وہ عظیم الشان اسلوب تعلیم ہے جس کی مثال تاریخ کو لاکھ کھنگالیے، کہیں نہیں ملتی۔ آپ نے قول کے ساتھ عمل کو اتنے مکمل طریقہ پر ملا لیا تھا کہ آپ کی ذاتِ مبارک قرآن مجید کی جیتی جاگتی زندہ و تابندہ تفسیر بن گئی تھی۔

جس کے سپرد نوع انسانی کی تعلیم اور تزکیہ ہو وہ خود اگر زندگی کے تمام نشیب و فراز اور معاشرہ کے پیچ و خم سے ہو کر نہ گزرے تو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا ہے، کیونکہ پھر اس کی تعلیم عملی حیثیت رکھنے کے بجائے علمی و نظریاتی یعنی اصولوں کا گلدستہ بن جائے گی۔ پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت میں ہم کو ایک بے مثال جامعیت ملتی ہے، آپ کی سیرت سے زندگی کے تمام پہلو ابھرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ آپ کی زندگی میں ظلم کے پہاڑ بھی ٹوٹے، مصیبتوں اور آزمائشوں کی آندھیاں بھی آئیں، ناکامیوں کا اندھیرا بھی چھایا اور فتحمندی اور کامرانی کے شادیانے بھی بجے، قوت و حکومت کے پرچم بھی لہرائے اور مسرتوں کے پھول بھی کھِلے، آپ نے دوستی بھی برت کر دکھائی اور دشمنی بھی، جنگیں بھی لڑیں اور صلح و آشتی کے عہد نامے بھی کیے۔ دن دن بھر روزے رکھے اور رات رات بھر نمازیں بھی پڑھیں اور ملکی اور سیاسی گتھیاں بھی سلجھائیں۔ غارِ حرا میں خلوت نشین اور ماہ رمضان میں معتکف بھی رہے اور خانگی زندگی کا

---

[1] سیرۃ النبی جلد ششم، ص ۱۱۵

لطف بھی اٹھایا۔ دینِ پاک کے سب سے بڑے مبلّغ، ہادی اور رہبر کا فرض بھی انجام دیا اور مسلمانوں کی آزاد ریاست کی داغ بیل بھی ڈالی۔

نرمی اور سختی کے مواقع کو رسول اللہ صلعم خوب پہچانتے تھے، جہاں حدود الہٰی کے ٹوٹنے کا سوال ہوتا تھا وہاں آپ سختی کرنے میں تامل نہ فرماتے تھے اور جہاں مستحبات اور اخلاقی فضائل اور رذائل ہی سے تعلق ہوتا تھا وہاں آپ نرمی ہی سے کام لیتے تھے، حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کے لئے کسی سے بدلہ نہیں لیا۔ مگر جو کوئی شریعت کی حد توڑتا تھا اسے سزا دیتے تھے۔

ایک بار قریش کی ایک خاتون چوری کے جرم میں پکڑی گئیں، بعض عزیز ترین صحابہ نے ان کی سفارش کرنا چاہی تو آپ نے ان کی ایک نہ سنی اور فرمایا۔ تم سے پہلے کی قومیں اس لئے تباہ ہوئیں کہ جب ان میں معمولی لوگ گناہ کرتے تھے تو ان کو سزا دی جاتی تھی۔ اور جب بڑے لوگ کرتے تھے تو ان کا جرم نظر انداز کر دیا جاتا تھا۔ اسی موقع پر یہ بھی فرمایا۔۔۔ کہ خدا کی قسم اگر میری بیٹی بھی کبھی یہ جرم کرے تو میں اللہ کے قانون کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹ ڈالوں گا۔

اسی طرح نرمی کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک دفعہ مسجد نبوی میں ایک بدوی آیا۔ اتفاق سے اسے پیشاب کی حاجت ہوئی تو وہ وہیں مسجد کے صحن میں پیشاب کرنے لگا۔ صحابہ نے یہ دیکھ کر چاروں طرف سے اسے ڈانٹنا شروع کیا۔ آپ نے روکا اور فرمایا کہ تم سختی کے لئے نہیں بلکہ نرمی کے لئے بھیجے گئے ہو، اسکے بعد اس بدوی کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مساجد عبادت کے گھر ہیں۔ یہاں نماز پڑھی جاتی ہے۔ یہ پیشاب پاخانہ کی جگہ نہیں ہے۔ اور لوگوں سے فرمایا کہ اس پر پانی بہا دو۔

(۲)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق کی بابت حضرت عائشہ صدیقہ سے دریافت کیا گیا تو انھوں نے ساری داستان ایک جملہ میں کہہ دی۔ انھوں نے کہا:۔

"آپ کا اخلاق من وعن قرآن تھا۔"

ایک اور موقع پر آپ نے ذرا تفصیل سے بتایا کہ:۔

"آنحضرت صلعم کی عادت کسی کو برا کہنے کی نہ تھی۔ آپ برائی کرنے والے کے ساتھ کبھی برائی نہ کرتے تھے بلکہ اسے معاف کر دیتے تھے، جب آپ کو کسی دو باتوں میں اختیار دیا جاتا تھا تو ان میں سے جو آسان ہوتی اسے اختیار کرتے تھے، بشرطیکہ اس میں کوئی گناہ کا شائبہ نہ ہو، کیونکہ گناہ سے آپ بہت دور رہتے تھے، کبھی اپنے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا۔ لیکن جو احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کرتا اس سے خدا خود انتقام لیتا تھا، (یعنی احکامِ ربّانی کے مطابق آپ اس کی سزا مقرر کرتے تھے) آپ نے نام لے کر کبھی کسی مسلمان پر لعنت نہیں کی، اور کسی غلام یا لونڈی یا کسی عورت یا خادم یا جانور کو اپنے ہاتھ سے نہیں مارا۔ آپ کسی کی درخواست رد نہیں فرماتے تھے بشرطیکہ وہ ناجائز نہ ہو۔ آپ جب گھر میں تشریف لاتے تو مسکراتے ہوئے آتے۔ دوستوں میں کبھی پاؤں پھیلا کر نہیں بیٹھتے تھے۔ باتیں اس طرح ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے کہ کوئی یاد رکھنا چاہے تو رکھ سکے۔"

حضرت علی مرتضیٰ آغازِ نبوت سے لے کر وفات تک برابر آپ کے ساتھ رہے تھے۔

ان سے حضرت امام حسینؓ نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق وعادات کے متعلق پوچھا تو انھوں نے کہا کہ:-

"آپ خندہ جبین ونرم خو تھے، سخت مزاج اور سنگ دل نہ تھے، نہ شور وغل کرتے تھے نہ کوئی برا کلمہ منھ سے نکالتے تھے، نہ عیب جو اور سخت گیر تھے، کوئی بات ناپسند ہوتی تو اغماض فرماتے تھے۔ آپ نے اپنے نفس سے یہ تین باتیں بالکل خارج کردی تھیں (۱) بحث ومباحثہ (۲) بے ضرورت باتیں کرنا (۳) بے مطلب کی بات میں پڑنا۔ دوسروں کے متعلق بھی تین باتوں سے پرہیز کرتے تھے۔ (۱) کسی کو برا نہیں کہتے تھے (۲) کسی کی عیب گیری نہیں کرتے تھے۔ (۳) کسی کی ٹوہ میں نہیں لگتے تھے، دوسروں کے منھ سے اپنی تعریف سننا پسند نہیں کرتے تھے۔ نہایت فیاض، نہایت راست گو نہایت نرم طبع اور نہایت خوش صحبت تھے، اگر کوئی دفعتاً سامنے آجاتا تھا تو مرعوب ہو جاتا تھا، لیکن جیسے جیسے آشنا ہوتا جاتا آپ سے محبت کرنے لگتا۔"[1]

ہند بن ابی ہالہ گویا آپ کے آغوش کے پروردہ تھے۔ ان کا بیان ہے کہ:-

"آپ نرم خو تھے، سخت مزاج نہ تھے، کسی کی توہین روا نہیں رکھتے تھے، چھوٹی چھوٹی باتوں پر اظہارِ شکر فرماتے تھے، کسی چیز کو برا نہیں کہتے تھے، کھانا جس قسم کا سامنے آتا تناول فرماتے تھے اور اس کو برا نہ کہتے۔ اگر کوئی کسی امر حق کی مخالفت کرتا تو آپ کو غصہ آجاتا، مگر اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی آپ کو غصہ نہیں آیا، نہ کسی سے انتقام لیا۔"[2]

حضرت انسؓ جو خادم خاص تھے کہتے ہیں کہ:-

---

[1] شمائل ترمذی [2] ایضاً

"میں نے دس برس تک آپ کی خدمت کی مگر آپ نے کبھی کسی معاملہ میں باز پرس نہیں فرمائی۔"[1]

مالک بن حویرث جو بیس دن تک آپ کی صحبت میں رہے کہتے ہیں کہ آپ رحمدل اور رقیق القلب تھے۔[2]

حجۃ الاسلام امامِ غزالی 'کیمیائے سعادت' میں تحریر فرماتے ہیں :-

"آپ مویشیوں کو خود چارہ ڈال دیتے۔ گھر میں جھاڑو دے لیتے، بکری دوھ لیتے، خادموں کو ان کے کاموں میں مدد دیتے، ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا لیتے، بازار سے سودا خرید لاتے، ادنیٰ و اعلیٰ کو پہلے خود سلام کرتے، کوئی ساتھ ہو لیتا تو اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر چلتے، غلام و آقا، حبشی و ترک میں فرق نہ کرتے، رات دن کا لباس ایک ہی رکھتے، کیسا ہی حقیر شخص دعوت دیتا، فوراً قبول فرما لیتے، جو کھانا سامنے رکھ دیا جاتا رغبت سے کھا لیتے، رات کے کھانے سے صبح کے لئے اور صبح کے کھانے سے رات کے لئے اٹھا نہ رکھتے۔ نیک مزاج، نرم خو، کشادہ دل اور خندہ جبیں تھے، مگر زور سے نہیں ہنستے تھے، اندوہ گیں تھے مگر ترش رو نہ تھے۔ سخی تھے مگر فضول خرچ نہ تھے۔"

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے لکھا ہے کہ :-

"کنبہ والوں اور خادموں پر بہت زیادہ مہربان تھے، زبانِ مبارک پر کبھی کوئی گندی بات یا گالی نہیں آئی، کسی پر لعنت نہیں

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح بخاری

نہیں کرتے تھے، دوسروں کی ایذا رسانی پر صبر فرماتے تھے، کنبہ کی صلاح اور قوم کی درستی پر بہت توجہ فرماتے تھے۔ ہر چیز اور ہر شخص کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے، آسمانی بادشاہت پر ہمیشہ نظر جمائے رہتے تھے“

صحیح بخاری میں ہے کہ :۔

”آپ اطاعت شعاروں کو بشارت سنانے والے گناہ گاروں کو ڈرانے والے اور بے خبروں کو ہوشیار کرنے والے خدا کے بندے اور رسول تھے، تمام معاملات اللہ پر چھوڑنے والے تھے۔ نہ درشت خو تھے۔ نہ سخت گو، بدی کے بدلے میں بدی نہ کرتے تھے۔ معافی مانگنے والوں کو معاف فرما دیتے تھے اور گناہ گاروں کو بخش دیتے تھے۔ ان کا کام مذاہب کی کجیوں کو مٹانا تھا، ان کی تعلیم اندھوں کو آنکھیں اور بہروں کو کان عطا کرتی تھی، آپ تمام خوبیوں سے آراستہ جامع اوصافِ حمیدہ تھے۔ سکینت ان کا لباس، نیکی ان کا شعار، تقویٰ ان کا ضمیر حکمت ان کا کلام، عدل ان کی سیرت، راستی انکی شریعت اور ہدایت انکی رہنما تھی، آپ ذلت دور کرنے والے، گمناموں کو رفعت بخشنے والے، مجہولوں کو طاقت دینے والے، قلت کو کثرت اور تنگدستی کو غنا سے بدلنے والے تھے“

مشہور انگریز ادیب ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے لکھا ہے کہ :۔

”آپ کا گھر بار معمولی اور کمتر لوگوں کے طرز کا تھا اور آپ کی عام غذا جو کی روٹی اور پانی۔ اکثر آپ کے چولھے میں مہینوں آگ روشن نہیں ہوتی تھی، آپ کے سیرت نگار فخریہ بیان کرتے ہیں کہ آپ اپنے ہاتھ سے

جوتے گانٹھ لیتے اور کپڑے میں پیوند لگا لیا کرتے تھے .... کسی طرّہ دار شہنشاہ کی اتنی اطاعت نہیں کی گئی جتنی کہ اس شخص کی۔ اسکے اپنے ہاتھ کی سی ہوئی عبائیں ہوتی تھیں"۔

اور رومیوں کے انحطاط و زوال کا شہرہ آفاق مورّخ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) لکھتا ہے کہ:۔

"اپنی دنیوی طاقت کے عروج پر بھی محمدؐ کی شرافت نفس نے شاہانہ تزک و احتشام روا نہ رکھا۔ خدا کا پیغمبر گھر کے ادنیٰ کام اپنے ہاتھ سے کرتا تھا۔ آگ روشن کرتا تھا، جھاڑو دیتا تھا، بھیڑوں کا دودھ دوہتا تھا، اور اپنے کمبل اور جوتوں کی خود مرمت کر لیا کرتا تھا۔ تارک الدنیا راہبوں کے مجاہدوں سے نفرت کرتے ہوئے آپ بلا تصنّع اور بلا تکلف ایک عرب اور سپاہی کی طرح سادہ غذا استعمال فرماتے تھے۔ خاص خاص مواقع پر آپ صحابہ کی دل کھول کر ضیافت کرتے تھے، مگر نجی زندگی میں اکثر آپ کے گھر میں ہفتوں چولھا نہیں جلتا تھا"۔

فرانسیسی مورّخ پروفیسر سیڈیو (PROF. SEDILLOT) نے اخلاق و عادات نبوی کا ذکر کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے:۔

"آپ خندہ رو، ملنسار، اکثر خاموش رہنے والے، بکثرت ذکرِ خدا کرنے والے، لغو اور بیہودہ باتوں سے نفرت کرنے والے، بہترین رائے رکھنے والے تھے ....

"آپ نہایت منصف مزاج تھے، مسکینوں سے محبت کرتے تھے، غریبوں

میں رہ کر خوش ہوتے تھے، تنگدست کو اس کی تنگدستی کی وجہ سے نہ تو حقیر اور نہ بادشاہوں کو ان کی بادشاہت کی بنا پر برتر سمجھتے تھے۔"

قرآن مجید کے انگریز مترجم اور مفسر مارماڈیوک پکتھال (MARMADUKE PICKTHALL) نے یہ الفاظ لکھے ہیں:۔

"عرب پر حکمراں ہو جانے کے بعد بھی آپ اپنے پیروؤں سے برادرانہ انداز سے ملتے رہے، آپ کو نقیبوں اور پہرہ داروں کی ضرورت نہ تھی۔ اپنے لوگوں میں سادگی اور آزادی سے گھومتے پھرتے تھے، ایک رہنما کی حیثیت سے، ایک مصلح کی حیثیت سے، اور ایک آزملئے ہوئے دوست کی حیثیت سے۔"

جرمن مصنف ڈاکٹر گستاف وائل (GUSTAV WEIL) نے لکھا ہے:۔

"محمد اپنی قوم میں ایک روشن مثال تھے، آپ کا کردار پاک اور بے داغ تھا۔ لباس اور غذا میں ایک انوکھی سادگی تھی۔ مزاج میں اتنی سادگی اور بے تکلفی تھی کہ اپنے ساتھیوں سے کوئی خاص تعظیم و تکریم قبول نہیں فرماتے اور اپنے غلام سے کوئی ایسی خدمت نہ لیتے تھے جو خود انجام دے سکتے، آئے دن آپ بازاروں میں سودا خریدتے، اور گھر میں کپڑوں میں پیوند لگاتے اور بکری دوہتے نظر آتے تھے، ہر وقت ہر شخص کی آپ تک رسائی ہو سکتی تھی، بیماروں کی عیادت کرتے تھے اور ہر ایک سے ہمدردی رکھتے تھے، آپ کی سخاوت اور خیر و خیرات کی کوئی حد نہ تھی۔ باوجود ان بے اندازہ تحائف کے جن کی آپ پر ہر وقت بارش ہوا کرتی تھی، آپ نے نہایت مختصر ترکہ

چھوڑا اور وہ بھی بیت المال کو ہبہ فرما گئے تھے۔"

اور واشنگٹن ارونگ (WASHINGTON IRVING) کا یہ بیان ہے:-

"اپنے انتہائی قوت و اقتدار کے دور میں بھی آپ نے وضع قطع، اور اخلاق و عادات میں وہی سادگی قائم رکھی جو پریشانی اور بے طاقتی کے زمانہ میں آپ کا وصف رہی تھی، شاہانہ کروفر تو بڑی بات ہے، اگر کسی مجلس میں آپ کے ساتھ کچھ خصوصیت کا برتاؤ کیا جاتا تو وہ بھی آپ کو بہت ناگوار ہوتا تھا۔"

اس طرح کی شہادتیں اور بیانات کہاں تک نقل کئے جائیں ان کا سلسلہ لامتناہی ہے۔

(۳)

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے اعلیٰ اخلاق اور پاکیزہ اوصاف کا کچھ اندازہ ذیل کے واقعات سے لگایا جا سکتا ہے۔

ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کرنے آیا، آپ کو اطلاع ہوئی، تو فرمایا کہ "اگرچہ وہ اپنے قبیلہ کا اچھا آدمی نہیں ہے مگر آنے دو۔" وہ آیا تو آپ نے نرمی سے گفتگو کی، اس پر حضرت عائشہؓ کو تعجب ہوا اور اس کے واپس جانے کے بعد انھوں نے آپ سے دریافت کیا کہ "آپ تو اسے اچھا آدمی نہیں سمجھتے تھے پھر اتنی شگفتہ مزاجی سے کیوں باتیں کیں؟" آپ نے جواب دیا "خدا کے نزدیک وہ آدمی سب سے برا ہے جس کی بد زبانی کے باعث لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔"

اپنی غیر معمولی فیاضی اور دریا دلی کی وجہ سے آپ اکثر مقروض رہا کرتے تھے۔

مدینہ میں آپ وقتاً فوقتاً یہودیوں سے قرض لیا کرتے تھے، اگر کبھی ادائیگی میں دیر ہو جاتی تو وہ سختی سے تقاضہ کرتے تھے۔ آپ ان کی بدمزاجی خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا کرتے تھے۔

ایک دن ایک بدّو گوشت بیچ رہا تھا۔ آپ نے اس بھروسہ پر کہ گھر میں کھجوریں رکھی ہیں کچھ کھجوروں کے عوض میں گوشت چکا لیا۔ لیکن گھر پہنچ کر معلوم ہوا کہ کھجوریں ختم ہو چکی تھیں، چنانچہ آپ نے باہر آکر بدّو سے فرمایا کہ "اتفاق سے میرے یہاں اس وقت کھجوریں نہیں ہیں، تم اپنا گوشت واپس لے لو۔" اس نے شور کرنا شروع کر دیا کہ "ہائے بددیانتی!" صحابہ نے بہتیرا سمجھایا کہ بھلا اللہ کے رسول بددیانتی کریں گے؟" مگر وہ نہ مانا اور اپنی کہے گیا صحابہ کو یہ برا لگا اور انھوں نے ڈانٹ کر اسے خاموش کرنا چاہا مگر آپ نے انھیں روک دیا کہ "اسے کہنے دو ــــ اس کا حق ہے۔" آخر آپ نے ایک انصاری کے یہاں سے کھجوریں منگوا کر گوشت کی قیمت ادا کی۔

آپ کی خدمت میں ایک بار ایک سائل حاضر ہوا۔ آپ نے اسے بٹھا لیا۔ پھر دوسرا اور اسکے بعد تیسرا آیا، آپ نے ان سے بھی کہا کہ بیٹھو۔ میرے پاس تو اس وقت کچھ نہیں ہے لیکن خدا دے گا تو تمھاری حاجت پوری کر دوں گا۔" اتنے میں کسی نے چار اوقیہ چاندی ہدیہ کی، آپ نے ایک ایک اوقیہ تینوں سائلوں میں تقسیم کر دی اور چوتھی کی بابت اعلان کر دیا کہ جسے ضرورت ہو لے لے۔ مگر رات ہو گئی اور کوئی اس کا خواہشمند نہ ہوا، مجبوراً جب سونے کے لئے لیٹے تو اسے سرہانے رکھ لیا مگر نیند نہ آئی۔ بار بار اٹھتے اور نماز پڑھنے لگتے۔ حضرت عائشہ رضؓ نے یہ دیکھا تو انھیں تشویش ہوئی۔ انھوں نے پوچھا "کیا کچھ طبیعت ناساز ہے؟" آپ نے فرمایا "نہیں" انھوں نے کہا "پھر آپ اس قدر

بے چین کیوں ہیں؟" تو آپ نے سرہانے سے چاندی نکال کر دکھائی اور فرمایا" اس نے مجھے بے چین کر رکھا ہے، مجھے ڈر ہے کہ کہیں مجھے اس حال میں موت نہ آجائے کہ یہ چاندی میرے پاس ہو۔"

حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول پاکؐ نے ان سے فرمایا کہ" ابوذر! اگر اُحد پہاڑ بھی میرے لئے سونا ہو جائے تب بھی میں یہ نہ پسند کروں گا کہ تین راتیں گزر جائیں اور میرے پاس ایک دینار بھی رہ جائے، علاوہ اس کے کہ جو میں ادائیگی قرض کے لئے چھوڑوں۔"

بعض اوقات ایسا بھی کرتے کہ کسی سے کوئی چیز مول لیتے تو قیمت ادا کرنے کے بعد وہی چیز اسے بطور ہدیہ عنایت فرما دیتے۔

کھانے پینے کی معمولی سے معمولی چیز کو بھی تنہا نوش نہ فرماتے تھے، جو لوگ موجود ہوتے ان کو ضرور شریک کر لیتے تھے۔

ایک بار آپ کہیں جا رہے تھے کہ ایک حاجتمند نے سوال کیا۔ آپ اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھے، لیکن اسے رخصت نہیں کیا بلکہ ساتھ چلنے کو کہا کہ شاید راستہ میں کوئی صورت نکل آئے۔ حضرت عمر فاروق بھی ہمراہ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ" آپ خود خالی ہاتھ ہیں تو آپ پر کیا ذمہ داری ہو سکتی ہے۔" ایک اور صحابی وہیں موجود تھے، انھوں نے کہا" یا رسول اللہ آپ دیئے جائیے۔ خدا آپ کو محتاج نہیں کرے گا۔" یہ بات آپ کو بہت پسند آئی۔

آپ اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہراؓ سے بے انتہا محبت کرتے تھے۔ وہ تشریف لاتیں تو آپ فرطِ محبّت سے کھڑے ہو جاتے اور ان کی پیشانی کو بوسہ دیتے۔

تاہم ان کی تنگ دستی کا یہ عالم تھا کہ ان کے گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی۔ اپنے ہاتھ سے چکی پیستیں اور خود ہی مشک میں پانی بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ان کے ہاتھوں میں گٹے پڑ گئے تھے اور مشکیزہ اٹھاتے اٹھاتے شانہ پر نیل ابھر آئے تھے۔ ایک غزوہ میں کچھ کنیزیں مسلمانوں کے ہاتھ آئیں تو انھیں خیال ہوا کہ اگر ایک کنیز ان کی خدمت میں دے دی جائے تو ان کو اتنی محنت نہ کرنی پڑے، خود باپ سے کہنے کی تو ہمت نہ ہوئی حضرت علیؓ کے ذریعہ سفارش کرائی، لیکن آنحضرت صلعم نے فرمایا: "ابھی اصحاب صفہ کا انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ جب تک یہ نہ ہولے میں کسی اور کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔"

مسلمان، مشرک، کافر سبھی آپ کے مہمان ہوا کرتے تھے، آپ ان کی یکساں تواضع اور مدارات فرماتے تھے، اکثر گھر میں جو کچھ ہوتا وہ مہمانوں کی نذر ہو جاتا اور اہل و عیال فاقہ سے رہتے۔ مہمانوں کے آرام کا اتنا خیال تھا کہ رات کو اٹھ اٹھ کر ان کی خبر گیری فرمایا کرتے تھے۔

سائلوں کی حتی الامکان مدد فرمانے کے باوجود گداگری سے آپ کو بڑی نفرت تھی۔ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ اگر کوئی شخص پیٹھ پر لکڑی لاد کر بیچے اور اس طرح اپنی آبرو بچائے تو یہ سوال کرنے سے بہتر ہے۔

ایک دفعہ ایک انصاری نے آپ سے سوال کیا۔ آپ نے ان سے پوچھا "تمھارے پاس کوئی چیز ہے؟" ان کے پاس ایک بچھونا اور ایک پیالہ تھا، وہ منگوا کر آپ نے دو درہم کو فروخت کر دیا اور انصاری سے فرمایا کہ "ایک درہم کا کھانے کا سامان لیکر گھر دے آؤ اور دوسرے کی رسی خرید کر جنگل سے اس میں لکڑیاں باندھ کر لاؤ اور شہر میں بیچو۔" پندرہ روز بعد وہ پھر خدمتِ نبوی میں حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔

حضور سرورِ کائناتؐ یہ دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور فرمایا یہ اس سے بہتر ہے کہ کوئی شخص قیامت میں گداگری کا داغ چہرہ پر لے کر اٹھے۔

اپنے خاندان کے لئے آپ نے صدقہ و زکوٰۃ لینا حرام کر دیا تھا، فرمایا کرتے تھے کہ "میں کبھی کبھی اپنے بستر پر کھجوریں پڑی ہوئی دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے کہ اٹھا کر کھالوں مگر یہ سوچ کر رک جاتا ہوں کہ کہیں صدقہ کی نہ ہوں"۔

حضرت امام حسنؓ نے ایک بار صدقہ کی کھجوروں میں سے ایک کھجور منھ میں ڈال لی تو آپ نے انھیں ٹوکا۔ کیا تم کو معلوم نہیں ہے کہ ہمارا خاندان صدقہ نہیں کھاتا"۔ حضرت امام حسنؓ نے فوراً کھجور اُگل دی۔

آپ کو کسی کا احسان لینا پسند نہ تھا اور بغیر قیمت دیئے کوئی چیز نہیں لیتے تھے۔ ایک سفر میں حضرت عمرؓ اور عبداللہ بن عمرؓ دونوں آپ کے شریک تھے، عبداللہ بن عمرؓ کی سواری کا اونٹ سرکش تھا اور بار بار رسول اللہ صلعم کے ناقہ کے آگے نکل جاتا تھا حضرت عمرؓ ہر دفعہ ان کو ڈانٹتے تھے۔ وہ لاکھ کوشش کرتے مگر اونٹ قابو میں نہ آتا تھا۔ آپ نے عبداللہ بن عمرؓ کی مجبوری محسوس کی تو حضرت عمرؓ سے فرمایا کہ "تم یہ اونٹ میرے ہاتھ بیچ ڈالو۔ انھوں نے نذر کرنا چاہا لیکن بلا قیمت لینے سے آپ نے انکار کر دیا، آخر کار حضرت عمر دام لینے پر راضی ہو گئے اور آپ نے اونٹ خرید کر عبداللہ بن عمر کو دیدیا کہ "اب یہ تمھارا ہے"۔

آپ کے عدل و انصاف کی یہ شہرت تھی کہ یہودی تک اپنے مقدمات آپ کے سامنے پیش کرتے تھے اور آپ ان کی شرع کے مطابق فیصلہ کرتے تھے۔ آپ کا قول تھا کہ "قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے علاوہ اور کوئی سایہ نہ ہوگا تو

سات اشخاص کو خدا اپنے سایہ میں لے گا جن میں ایک عادل فرمانروا ہوگا۔"

شرعی حدود کے بارہ میں آپ کسی کی سفارش نہیں سنتے تھے۔ اسامہ بن زیدؓ آپ کو بہت محبوب تھے۔ ایک بار انھوں نے ایک ملزمہ کی معافی کی درخواست کی تو آپ نے نہایت برہم ہو کر فرمایا کہ "تم حدود شرعی میں مداخلت کرتے ہو؟ خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی ایسا کرتی تو میں اُسے وہی سزا دیتا جو اسکو دوں گا۔"

ایک دن آپ مال غنیمت تقسیم کر رہے تھے، لوگوں کا بہت ہجوم تھا۔ ایک بے ادب شخص منھ کے بل آپ پر آ پڑا، آپکے ہاتھ میں ایک پتلی سی چھڑی تھی اس سے آپ نے اس کو ٹھوکا دیا، اتفاق سے چھڑی اس کے سر پر لگی اور خراش آگئی۔ آپنے فوراً اس کی طرف چھڑی بڑھادی اور فرمایا "بدلہ لے لو۔" اس نے کہا "یا رسول اللہؐ میں نے معاف کیا۔"

رحم کی صفت اتنی غالب تھی کہ سزا دینے میں آپ انتہائی احتیاط برتتے تھے۔ اور جہاں تک گنجائش ہوتی درگزر کرنا چاہتے تھے۔

ایک صاحب نے آکر اقرار کیا کہ وہ زنا کے مرتکب ہو گئے تھے۔ آپنے منھ پھیر لیا، وہ گھوم کر دوسری طرف حاضر ہوئے۔ آپ نے پھر رُخ موڑ لیا۔ جب کئی بار ایسا ہی ہوا تو آپ نے پوچھا "تمھیں جنون تو نہیں ہو گیا ہے؟" انھوں نے کہا "جی نہیں۔" پھر آپ نے پوچھا "تمھاری شادی ہو چکی ہے؟" انھوں نے عرض کیا "جی ہاں۔" آپ نے فرمایا "تم نے شاید صرف ہاتھ لگایا ہوگا۔" انھوں نے کہا "جی نہیں، مجامعت کی ہے۔" ان ساری وضاحتوں کے بعد ناچار آپنے حکم دیا کہ سنگسار کئے جائیں۔"

مہر و الطاف سے دشمن اسی طرح فیضیاب ہوتے تھے جیسے دوست۔ مکہ والوں کی دشمنی کے باعث ایک بار ثمامہ بن اثال نے نجد سے مکہ غلّہ جانا روک دیا تھا۔

آپ کو اطلاع ہوئی تو فوراً حکم دیا کہ غلّہ نہ روکا جائے۔

ایک روز ایک درخت کی شاخ سے تلوار لٹکا کر اس کے سایہ میں آپ سو رہے تھے کہ غورث بن الحراث ادھر سے گزرا۔ اس نے چپکے سے تلوار لی اور اسے کھینچ کر آپ کو جگایا اور بولا "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" آپ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر فرمایا "اللہ!" غورث پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ آپ نے اسکے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور ارشاد فرمایا "اب تم کو کون بچا سکتا ہے؟" غورث سے کچھ جواب نہ بن پڑا۔ آپ نے اسے معاف کر دیا۔

حضرت زینبؓ آپ کی صاحبزادی حمل سے تھیں۔ ان کے ہبار نے نیزہ مار دیا اور حمل ساقط ہو گیا۔ بالآخر یہی صدمہ ان کی موت کا باعث ہوا۔ ہبار نے خدمتِ نبوی میں حاضر ہو کر معافی چاہی اور رحمتِ عالم نے معاف کر دیا۔

بچوں سے نبی اکرمؐ بڑی محبت فرماتے تھے۔ ان کے قریب سے گذرتے تو خود سلام کرتے اور ان کے سروں پر ہاتھ پھیرتے۔ بوڑھوں کا بھی بہت احترام کرتے تھے، مکّہ فتح ہونے کے بعد حضرت ابو بکر صدیقؓ اپنے بوڑھے اور نابینا باپ کو بیعت کرانے آپ کے پاس لے کر آئے تو آپنے بڑی نرمی سے فرمایا "تم نے ان کو کیوں زحمت دی؟ میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔"

آپنے جنگ میں بھی کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔ ابی بن خلف آپ کا شدید دشمن تھا، اس نے ایک نفیس گھوڑا تیار کیا تھا اور ہر جگہ کہتا پھرتا تھا کہ میں نے یہ اس لئے تیار کیا ہے کہ اس پر سوار ہو کر محمدؐ کو قتل کروں گا۔ اُحد کی لڑائی میں وہ صفوں کو چیر پھاڑ کر آپ کے قریب پہنچ گیا۔ صحابۂ کرام نے اسے روکنا چاہا، مگر آپ

نے فرمایا کہ آنے دو اور جب وہ بالکل پاس آگیا تو تو ایک مجاہد سے نیزہ لے کر اس کی گردن میں آہستہ سے اسکی نوک چبھو دی۔ وہ چیخ کر بھاگا۔ لوگوں نے یہ دیکھ کر اس سے کہا "یہ کوئی ایسا کاری زخم تو نہیں ہے کہ تم اتنا بد حواس ہو گئے" تو اس نے جواب دیا "کاری تو نہیں ہے مگر ہے تو محمدؐ کے ہاتھ کا"

شجاعت کے ساتھ بقول ابو سعید خدری "آپ میں کنواری لڑکیوں سے زیادہ حیا تھی"۔ آپ حیا کو "جزو ایمان" فرماتے تھے۔

خدمت گزاری کے لئے صحابۂ کرامؓ جسم و جان سے حاضر رہتے تھے، لیکن آپ اپنا کام خود کرنا پسند کرتے تھے، ادنیٰ سے ادنیٰ کام میں آپ کو عار نہ تھی۔ ایک شخص نے حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا گھر میں کیا مشغلہ رہتا تھا، تو انھوں نے بتایا کہ "آپ گھر کے کام کاج میں مشغول رہتے تھے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے تھے، جھاڑو بھی دے لیتے تھے، دودھ دوھ لیتے تھے، جوتا پھٹ جاتا تو خود مرمت کر لیتے تھے، اونٹ کو چارہ ڈال دیتے تھے اور بازار سے سودا خرید لاتے تھے۔

حضرت انس بن مالکؓ ایک دن آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے دیکھا کہ آپ اپنے ہاتھ سے اونٹ کے بدن پر تیل مل رہے ہیں

اجتماعی محنت و مشقت کے کاموں میں آپ برابر کی شرکت فرماتے تھے۔ قبا اور مدینہ کی مسجدوں کی تعمیر ہو یا جنگ میں خندق کھودنا ہو آپ ہمیشہ پیش پیش رہتے تھے۔ ایک سفر میں صحابہ نے بکری ذبح کی اور اس کو پکانے کا کام آپس میں بانٹ لیا۔ نبی اکرمؐ نے فرمایا "جنگل سے لکڑی میں لاؤں گا"۔ صحابہ نے لاکھ عرض کیا کہ آپ آرام سے بیٹھیں۔ ہم سارا انتظام کر لیں گے۔ لیکن آپ نے فرمایا "میں امتیاز

پسند نہیں کرتا۔"

دوسروں کے کام کر دینا بھی آپ کی عادت میں داخل تھا، ایک دفعہ جماعت کے لئے جماعت کھڑی ہو چکی تھی کہ ایک بدو آیا اور اس نے بڑی بے باکی سے آپ کا دامن پکڑ کر کہا "میرا تھوڑا سا کام رہ گیا ہے، ایسا نہ ہو کہ میں اسے بھول جاؤں۔ اس لئے پہلے اسے کر دو۔" آپ چپ چاپ اس کے ساتھ ہو گئے اور پہلے اس کی خدمت انجام دے دی پھر نماز ادا کی۔

خبابؓ ایک صحابی کسی لشکر میں گئے ہوئے تھے، ان کے گھر میں کوئی دوسرا مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوھنا نہیں آتا تھا۔ آپ روزانہ ان کے گھر جاکر دودھ دوھ آتے تھے۔

حضرت انسؓ ایک عرصہ تک آپ کے خادم رہے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ آپ نے ان سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ تم نے فلاں کام کیوں کیا یا کیوں نہ کیا، انہی سے روایت ہے کہ ان کے لڑکپن کے زمانہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کسی کام پر بھیجنا چاہا تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میں نہ جاؤں گا اور باہر نکلکر لڑکوں کے ساتھ کھیلنے لگے، کچھ دیر بعد آنحضرت صلعم نے پیچھے سے آکر پیار کے ساتھ ان کی گردن پکڑ لی اور فرمایا "انس اب وہ کام کر دو۔"

زہد و قناعت کی یہ صورت تھی کہ حضرت عائشہؓ راوی ہیں کہ ہجرت کے بعد آنحضرت صلعم کو کبھی مسلسل تین روز تک گیہوں کی روٹی میسر نہ ہوئی، اکثر دو دو مہینے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا اور اہل بیت کھجور اور پانی پر بسر اوقات کرتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ فاقہ کی وجہ سے آپ کو بات کرنا مشکل ہو جاتا۔ صحابہؓ یہ کیفیت دیکھ کر سمجھ جاتے اور آپ کو

مہمان بنا کر اپنے گھر لے جاتے۔

دنیا سے بے رغبتی کا اندازہ آپ کی ان دو دعاؤں سے ہو سکتا ہے۔

(۱) اے اللہ! ایسا کر کہ ایک دن مجھے بھوکا رکھ اور ایک دن کھانے کو دے۔ تاکہ بھوک میں تجھ سے گڑگڑا کر مانگا کروں اور کھا کر تیرا شکر کیا کروں۔" (۲) اے اللہ! اولادِ محمدؐ کو بس اتنا دے کہ بھوکی نہ رہے۔"

عہد کے اتنے پابند، بات کے اتنے سچے، قول کے اتنے پکے اور معاملت کے اتنے صاف تھے کہ قریش تک نے آپ کو متفقاً "امین" کا خطاب دیا تھا۔ آپ کا اصول تھا کہ "جس میں پاسِ عہد نہیں اس میں دین نہیں۔"

ایک بار مکہ کے ایک غلام ابو رافع قریش کے سفیر بن کر مدینہ آئے۔ وہ آپ کی دلآویز شخصیت سے ایسا متاثر ہوئے کہ انھوں نے فوراً اعلان کر دیا کہ اب کبھی لوٹ کر کافروں میں نہ جائیں گے، لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ایک قاصد کو اپنے پاس روک کر عہد شکنی نہیں کر سکتا۔ تم اس وقت لوٹ جاؤ اور اگر مکہ پہنچ کر تمھارے دل کی یہی کیفیت رہے تو پھر چلے آنا۔"

آپ کا بدترین دشمن ابوجہل بھی آپ کی صداقت کا معترف تھا۔ اس نے ایک بار آپ کے سامنے اس کا اقرار یوں کیا کہ "محمدؐ! میں تم کو جھوٹا نہیں کہتا لیکن اپنے دین کی جو باتیں تم ہم کو بتاتے ہو ان کو میں صحیح نہیں مانتا۔"

حق گوئی دراصل شجاعت ہی کی ایک شاخ ہے۔ ایک خطبہ میں آپ نے یہ نصیحت کی کہ "کسی شخص کو جب کوئی حق بات معلوم ہو تو چاہیئے کہ اس کے کہنے سے کسی انسان کا خوف مانع نہ ہو۔"

ایک دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا کہ "کوئی شخص خود کو حقیر نہ سمجھے۔" اس پر صحابہ رضؓ نے عرض کیا کہ "ہم میں کوئی شخص اپنے کو کیونکر حقیر سمجھ سکتا ہے؟" ارشاد ہوا کہ "اس طرح کہ اس کو خدا کے بارے میں ایک بات کہنے کی ضرورت ہو اور وہ نہ کہے۔ قیامت کے روز خدا اس سے پوچھے گا کہ تم کو میرے متعلق فلاں بات کہنے سے کس نے روکا؟" وہ کہے گا کہ "انسانوں کے خوف نے۔" خدا کی طرف سے اس کو یہ جواب ملے گا کہ "تم کو سب سے زیادہ میرا خوف ہونا چاہیئے۔"

آپ کی ایک حدیث ہے کہ "سب سے بڑا جہاد ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا ہے۔"

خوش معاملگی اور دیانت داری کا اس سے زیادہ اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے کہ مکّہ کے کفار بھی آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔

سائبؓ ایک تاجر تھے وہ مسلمان ہو کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے تو لوگوں نے رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا تعارف کرانا چاہا لیکن آپ نے فرمایا کہ "میں ان کو تم سے زیادہ جانتا ہوں۔" سائبؓ نے بتایا کہ "آپ تجارت میں میرے شریک تھے، میرے ماں باپ آپ پر قربان آپ نے ہمیشہ معاملہ صاف رکھا۔"

ایک شخص سے آپ نے کچھ کھجوریں قرض لی تھیں۔ ادائیگی کے وقت کچھ کھجوریں جو اس کو دینے کے لئے آپ کے پاس تھیں وہ اتنی اچھی نہ تھیں جتنی کہ اس کی تھیں، اس لئے اس نے لینے سے انکار کیا۔ صحابہ رضؓ نے کہا کہ "تم رسول اللہؐ کی عطا کی ہوئی چیز سے انکار کرتے ہو؟" اس نے کہا کہ "اگر رسول اللہؐ ہی معاملہ میں صفائی نہ برتیں گے تو پھر کس سے توقع کی جائے۔" یہ سن کر آپ کے آنسو آگئے اور فرمایا کہ "یہ سچ ہے۔"

امانت کا تعلق آپ کے نزدیک صرف مادی اشیاء سے نہیں تھا، قانونی اور اخلاقی امور بھی اس میں شامل تھے۔ آپ کی احادیث میں ہے کہ کسی کا کوئی بھید معلوم ہو تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے یا کسی کی بابت کوئی شخص کوئی نامناسب بات کہے یا بری رائے ظاہر کرے تو اس کو اس تک پہنچا کر فتنہ و فساد کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے، یا کوئی کسی نجی معاملہ میں مشورہ کرے تو اسے اپنے ہی تک محدود رکھنا اور حتی المقدور بہترین مشورہ دینا بھی امانت داری میں شامل ہے۔ اسی طرح ملازم کا خیر خواہی اور مستعدی سے خدمت انجام دینا، بیوی، بچوں، اعزا، احباب اور ہمسایہ وغیرہ کے حقوق ادا کرنا یہ سب امانتیں ہیں اور ان میں کوتاہی کرنا امانتداری کے خلاف ہے وغیرہ وغیرہ۔

یہ حدیث بھی کس قدر جامع ہے کہ "اس ہستی کی قسم جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے کسی بندہ کا اس وقت تک دین درست نہ ہوگا جب تک اسکی زبان درست نہ ہو ..... اور جو کوئی ناجائز راستہ سے مال پائے گا اور اس میں خرچ کرے گا تو اس کو اس میں برکت نہ دی جائیگی اور اگر اس میں سے خیرات دے گا تو قبول نہ ہوگی اور جو اس میں سے بچ رہے گا وہ اس کے سفر دوزخ کا توشہ ہوگا۔ بری چیز بری چیز کا کفارہ نہیں بن سکتی ہے، البتہ اچھی چیز بری چیز کا کفارہ ہوتی ہے۔"

آپ نے یہ نصیحت بھی فرمائی کہ "میری امت اس وقت تک فطری صلاحیت پر قائم رہے گی جب تک وہ امانت کو غنیمت اور زکوٰۃ کو جرمانہ نہ سمجھے گی۔

(۴)

غیبت، بہتان، عیب جوئی، بدگوئی، بدگمانی، دورُخا پن وغیرہ سے آپ سخت نفرت فرماتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ راوی ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ "جو کوئی اپنے غلام پر تہمت

لگائے جبکہ وہ بے گناہ ہو تو قیامت کے روز اس کی پیٹھ پر کوڑے پڑیں گے"۔

قرآن شریف کی ان آیات میں ان اخلاقی رذائل کے بارے میں کتنے صاف اور صریح احکام پائے جاتے ہیں۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا	"مسلمانو! لوگوں کی بابت بہت شک کرنے
کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ	سے بچتے رہو۔ کیونکہ بعض شک گناہ ہیں
اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا یَغْتَبْ	داخل ہیں اور ایک دوسرے کی ٹوہ میں
بَّعْضُکُمْ بَعْضًا اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ	نہ رہا کرو۔ اور تم میں کوئی ایک دوسرے
اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْہِ مَیْتًا	کو برا نہ کہے، بھلا تم میں یہ کوئی گوارا کریگا
فَکَرِھْتُمُوْہُ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ	کہ اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھائے۔ اور
تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ۝ (حجرات-۲)	اللہ سے تقوی کرو بیشک اللہ توبہ قبول
	کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

کچھ لوگوں نے آپ سے دریافت کیا کہ غیبت کسے کہتے ہیں؟ آپ نے اس کے یہ معنیٰ بتلائے کہ "تمھارا اپنے بھائی کی اس چیز کا ذکر کرنا جسے وہ ناپسند کرے"۔ لوگوں نے پھر سوال کیا کہ "اور اگر ہمارے بھائی میں وہ عیب موجود ہو؟" آپ نے فرمایا "اگر وہ عیب اس میں موجود ہے تو تم نے غیبت کی اور اگر نہیں ہے تو تم نے بہتان باندھا"۔

منافقت اور دو رُخے پن سے یہ کہہ کر ڈرایا کہ "قیامت کے دن تم سب سے بُرا دو رُخے کو پاؤ گے۔ جو کچھ لوگوں کے پاس جاتا ہے تو اس کا رخ اور ہوتا ہے اور دوسروں کے پاس جاتا ہے تو اور۔

خوشامد اور بیجا تعریف و توصیف سے نفرت کرتے تھے۔ ایک شخص کسی حاکم کی

مدح کر رہا تھا۔ آپ کے صحابی حضرت مقدادؓ بھی موجود تھے۔ انھوں نے زمین سے خاک اٹھا کر اس کے منہ میں جھونک دی اور کہا کہ "رسول اللہؐ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ مداحوں (تعریف میں مبالغہ کرنے والوں) کے منہ میں خاک بھر دیں"!

اگرچہ آپ کثرت سے عبادت کرنے والے تھے لیکن رہبانیت اور جوگی پن کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ ایک گھر میں آپ کو جانے کا اتفاق ہوا تو وہاں چھت سے رسّی لٹک رہی تھی۔ دریافت کرنے پر لوگوں نے بتایا کہ فلاں عورت نے لٹکا رکھی ہے۔ وہ رات بھر عبادت کرتی ہے اور جب نیند کی شدت سے اونگھنے لگتی ہے تو اس سے لٹک جاتی ہے۔ آپ نے رسی کھلوا دی اور فرمایا کہ عبادت نافلہ بس اس وقت تک کرو جب تک نشاطِ طبع قائم رہے۔

حضرت عبداللہؓ بن عمرو بڑے مرتاض زاہد تھے، انھوں نے عمر بھر روزہ رکھنے کا عہد کر لیا۔ رسول اللہؐ صلعم کو معلوم ہوا تو ان کو بلوا بھیجا اور نصیحت فرمائی کہ "تم پر تمھارے جسم کا حق ہے، آنکھ کا حق ہے، بیوی کا حق ہے، مہینہ میں تین دن دن کے روزے کافی ہیں"! انھوں نے عرض کیا کہ ان میں اس سے زیادہ کی طاقت تھی، تب آپ نے فرمایا کہ اچھا تیسرے دن روزہ رکھا کرو۔ مگر انھوں نے کہا کہ میں اس سے بھی زیادہ کی طاقت رکھتا ہوں"! آپ نے فرمایا کہ "ایک دن ناغہ دے کر روزہ رکھا کرو"! انھوں نے پھر اصرار کیا مگر آپ نے اس سے زیادہ کی اجازت نہ دی۔

ایک دفعہ دو صحابیوں نے آکر عرض کیا کہ انھوں نے ترکِ حیوانات اور ترکِ نکاح کا عزم کر لیا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ "میں ان دونوں سے متمتع ہوتا ہوں"!

کبھی کبھی آپ جائز حظوظِ دنیوی سے لطف اندوز بھی ہوا کرتے تھے لیکن

امارت پسندی، تکلف اور نمائش سے ہمیشہ اجتناب فرماتے تھے، اور دوسروں کو بھی روکتے تھے۔

ایک روز آپ اپنی بیٹی حضرت فاطمہ زہرہؓ کے یہاں دعوت میں تشریف لیگئے تو وہاں آرائش کی خاطر پردے لٹکے ہوئے تھے۔ ان پر نظر پڑتے ہی آپ لوٹ آئے۔ حضرت علیؓ نے وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ "پیغمبر کو مناسب نہیں کہ زیب و زینت والے مکان میں جائے۔"

حضرت فاطمہؓ ہی کے گلے میں ایک بار سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا "کیا تم کو برا نہ لگے گا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے۔"

ایلا[1] کے زمانہ میں حضرت عمر آپ کی قیام گاہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ جسم مبارک پر صرف ایک تہبند تھا، ایک کھرّی چارپائی بچھی تھی، تکیہ میں درخت کی چھال بھری تھی، ایک طرف مٹھی بھر جَو رکھے تھے اور مشکیزہ کی کچھ کھالیں چھت سے لٹک رہی تھیں، حضرت عمر کا بیان ہے کہ اس بے سروسامانی سے ان کو بہت رنج ہوا اور انھوں نے کہا کہ "قیصر و کسریٰ تو عیش و عشرت کے مزے لوٹیں اور اللہ کے رسول کی یہ حالت ہو کہ بدن پر چارپائی کے بان کی بدّھیاں پڑی ہوں۔" جواب میں ارشاد ہوا کہ "کیا تم کو یہ پسند نہیں کہ وہ دنیا کا عیش لیں اور ہم آخرت کا عیش۔"

آپ "ضروری عمارت کے علاوہ ہر عمارت کو انسان کے لئے وبال" سمجھتے تھے۔

---

[1] ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کی ایک بات سے ناراض ہو کر (غالباً ان کی تربیت کے لئے) ان سے علٰحدگی اختیار کر کے ایک حجرہ میں الگ قیام فرمالیا تھا۔ اسی کو ایلا کا واقعہ کہا جاتا ہے۔ ایلا فقہ کی ایک خاص اصطلاح ہے۔

اکثر یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ گھر میں ایک بستر اپنے لئے، ایک بیوی کے لئے اور ایک مہمان کے لئے ہونا چاہیئے۔ چوتھا اگر ہو تو وہ شیطان کا حصہ ہے۔"

مشرک و کافر، یہود و نصاریٰ سب کے ساتھ داد و ستد فرماتے تھے اور اگر معاملات میں اختلاف ہوتا تو مسلمانوں کا کبھی ناحق ساتھ نہ دیتے تھے۔

نجران کے عیسائیوں کا وفد مدینہ آیا تو آپ نے خود مہمانداری کی۔ وفد کے اراکین کو مسجد نبوی میں ٹھہرایا اور ان کو مسجد ہی میں اپنے طرز پر عبادت کرنے کی اجازت دیدی۔

ایک دفعہ ایک یہودی کو مجمع عام میں یہ کہتے ہوئے سن کر کہ "قسم اس خدا کی جس نے موسیٰ کو تمام انبیاء پر فضیلت دی۔ ایک صحابی سے ضبط نہ ہو سکا۔ انھوں نے پوچھا "ہمارے پیغمبر بھی؟" یہودی نے کہا "ہاں"۔ صحابی نے اس کے تھپڑ مار دیا۔ یہودی نے جاکر آپ سے شکایت کی۔ آپ نے ان صحابی کی سخت گرفت فرمائی۔

کچھ یہودیوں نے ایک روز شرارتاً آپ کے سامنے آکر السلام علیکم کے بجائے السّام علیکم (یعنی تم کو موت آئے) کہا۔ حضرت عائشہؓ ان کو برا بھلا کہنے لگیں۔ آپ نے فوراً ٹوکا "عائشہ، بدزبان نہ ہو، نرمی کرو، اللہ تعالیٰ ہر بات میں نرمی پسند کرتا ہے۔"

ابو بصرہ غفاری کا بیان ہے کہ جب وہ کافر تھے تو ایک بار مدینہ آئے اور آنحضرت صلعم کے مہمان ہوئے اور رات کو گھر کی تمام بکریوں کا دودھ پی گئے۔ آپ دیکھتے رہے لیکن کچھ نہ فرمایا۔ آپ کا کنبہ بھوکا رہا۔

خیبر میں ایک یہودن نے آپ کو کھانے میں زہر دیا، آپ کو زہر کا اثر محسوس ہونے لگا تو یہودیوں کو بلا کر تحقیقات کی، بالآخر انھوں نے اقبالِ جرم کر لیا، لیکن آپ نے کسی کچھ تعرض نہ فرمایا (اگرچہ آپ پر اس زہر کا اثر آخر وقت تک رہا) جب اسی زہر سے

ایک صحابی کا انتقال ہو گیا تب بھی آپ نے صرف اس یہودن سے ان کا قصاص لیا۔

عرب کے جاہل لوگ عورتوں پر بے دھڑک سختیاں کیا کرتے تھے، آپ نے عورتوں کے حقوق قائم کئے اور اپنے برتاؤ سے ان حقوق کو مستحکم بنا دیا۔

ایک خطبہ میں آپ نے مرد و عورت کے تعلقات کی بابت یہ فرمایا کہ :۔

"لوگو! عورتوں کے حق میں میری نیکی کی وصیت کو مانو۔ یہ تمھارے قبضہ اور تمھارے بس میں ہیں۔ تم سوا اس کے کسی اور بات کا حق نہیں رکھتے کہ اگر وہ کھلی بے حیائی کا کام کریں تو ان کو خوابگاہ میں علیحدہ کر دو اور ان کو ہلکی مار مارو۔ اگر وہ تمھاری بات مان لیں تو پھر ان پر الزام دھرنے کے پہلو نہ ڈھونڈو۔ بیشک تمھارا عورتوں پر اور عورتوں کا تم پر حق ہے۔ تمھارا حق تمھاری عورتوں پر یہ ہے کہ وہ تمھارا بستر دوسروں سے پامال نہ کرائیں اور نہ تمھارے گھروں میں ان کو آنے کی اجازت دیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور ان کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کو کھلانے اور پہنانے میں اچھا رویہ اختیار کرو۔

نکاح کے خطبوں میں عموماً قرآن کی یہ آیتیں پڑھا کرتے تھے :۔

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (بقرہ)	"عورتیں تمھارا لباس ہیں اور تم ان کا لباس ہو"
وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ (بقرہ)	"عورتوں کے حقوق مردوں پر وہی ہیں جو مردوں کے عورتوں پر اور مردوں کو عورتوں پر ایک منزلت حاصل ہے"
اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَاءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی	"مرد عورتوں پر با اختیار کئے گئے ہیں اس لئے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی

بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ ‏ ہے اور مرد عورتوں پر اپنا مال خرچ

اَمْوَالِهِمْ ‏ (نساء) ‏ کرتے ہیں۔"

رہبانیت پسندی کے تحت تجرد کی زندگی کی مذمت میں آپ نے فرمایا کہ "میں عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی وہ مجھ سے نہیں۔"

ایک سفر میں آپ کی بیوی حضرت صفیہ آپ کے ساتھ تھیں، جب وہ سوار ہونے لگتیں تو آپ اپنا گھٹنا بڑھا دیتے اور وہ اس پر پاؤں رکھ کر سوار ہو جاتیں۔ ایک بار اونٹ کا پاؤں پھسلا اور آپ دونوں زمین پر گر پڑے۔ حضرت طلحہ مدد کو دوڑے۔ وہ پہلے آپ کی طرف متوجہ ہوئے تو آپ نے فرمایا "پہلے عورت کی خبر لو۔"

ایک اور سفر میں اونٹوں کے کجاووں میں عورتیں سوار تھیں۔ ساربانوں نے چلتے چلتے حدی خوانی شروع کر دی۔ ان کی آواز سے اونٹ بھڑکنے لگے تو آپ نے فرمایا کہ "دیکھو آبگینوں کو صدمہ نہ پہنچ جائے۔"

حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماء حضرت زبیر سے بیاہی تھیں۔ حضرت زبیر جب مدینہ تشریف لائے تو ان کی کل جائیداد لے دیکر ایک گھوڑا تھا۔ حضرت اسماء خود ہی اسکے لئے جنگل سے گھاس چھیل لاتیں، پانی بھرتیں اور کھانا پکاتیں، ایک روز وہ سر پر کھجور کی گٹھلیاں لادے کہیں سے آرہی تھیں کہ آنحضرت صلعم اونٹ پر سوار ادھر سے گذرے۔ ان کو دیکھتے ہی آپ اونٹ پر سے اتر پڑے، ان کو سوار کر دیا اور خود پیدل گھر تشریف لے گئے۔

قدیم عرب میں بیواؤں سے شادی کرنا عیب کی بات سمجھا جاتا تھا۔ بعض ممالک میں اب بھی یہی دستور ہے۔ آنحضرت صلعم نے اس کی مخالفت میں عملی مثال پیش کی۔ آپ کی پہلی بیوی ایک بیوہ خاتون تھیں اور بعد میں بھی آپ نے جن محترم خواتین کو شرف زوجیت

بخشا سوا حضرت عائشہ کے وہ سب بیوہ ہی تھیں۔

یتیموں پر آپ نہایت درجہ مہربان تھے، آپ کے لطف و کرم کو دیکھکر صحابۂ کرام بھی یتیموں کی سرپرستی کے آرزومند رہتے تھے۔ بقول علامہ سید سلیمان ندویؒ ہر صحابی کا گھر ایک یتیم خانہ بن گیا تھا۔ حضرت عائشہ اپنے خاندان اور انصار کے بچوں کو اپنے گھر میں لاڈ پیار سے پالتی تھیں۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر نے تو اصول ہی بنالیا تھا کہ کسی یتیم بچے کو شریک کئے بغیر کھانا نہیں کھاتے تھے۔

ایک دفعہ ایک یتیم نے آپ کی عدالت میں ایک شخص کے خلاف ایک نخلستان کا دعویٰ کیا لیکن قاعدہ کے مطابق اس کا حق ثابت نہ ہوسکا، اس لئے آپ نے وہ نخلستان مدعاعلیہ ہی کا قرار دے دیا۔ یتیم بچہ فیصلہ سن کر رونے لگا۔ آپ کو اس پر اتنا ترس آیا کہ مدعاعلیہ سے سفارش کی کہ وہ اپنی خوشی سے نخلستان اس بچے کو دیدے۔ مگر وہ نہ مانا۔ ایک صحابی وہاں موجود تھے۔ انھوں نے اپنے ایک باغ کے عوض وہ نخلستان خرید کر بچہ کو ہبہ کر دیا۔

ایک حدیث میں ہے کہ "مسلمانوں میں سب سے اچھا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بھلائی کی جارہی ہو اور سب سے بُرا گھر وہ ہے جس میں کسی یتیم سے بدسلوکی کی جاتی ہو۔"

عربوں کی جاہل قوم جانوروں کے حق میں بلا کی بیدرد تھی۔ زندہ اونٹ کی پیٹھ پر سے گوشت کا لوتھڑا کاٹ لیا کرتے تھے۔ جانوروں کو کھڑا کر کے تیراندازی کی مشق کرتے تھے، جانوروں کا خون بھی پیا جاتا تھا۔ آپ نے ان سب باتوں کو حرام قرار دیا۔

ایک دفعہ ایک اونٹ نظر سے گذرا جو بھوک سے بہت لاغر ہوگیا تھا۔ آپ

نے فرمایا ــــ "ان بے زبانوں کی بابت خدا سے ڈرو۔" اسی طرح ایک گدھے کو دیکھ کر جس کا چہرہ داغا گیا تھا زبانِ مبارک سے نکلا "جس نے اسے داغا ہے اس پر خدا کی لعنت ہو۔"

آپ نے اس سلسلہ میں یہ حکایت بھی بیان کی کہ ایک مسافر کو شدید پیاس معلوم ہوئی۔ پانی کا کہیں نشان نہ تھا۔ بڑی مشکل سے ایک کنواں ملا۔ اس نے اپنے چمڑے کے موزہ میں ڈور باندھ کر پانی بھرا اور پینے ہی والا تھا کہ اسکی نظر ایک کتے پر پڑی جو پیاس سے مر رہا تھا۔ اس نے وہ پانی کتے کو پلا دیا اور خود دوبارہ بھر کر پیا۔ یہ بات خدا کو اتنی پسند آئی کہ اس نے مسافر کو بخش دیا۔ صحابہ نے یہ سن کر پوچھا کہ کیا کتوں کے ساتھ ہمدردی کرنے پر بھی اجر ہے؟ آپ نے فرمایا۔ "ہاں ہر جاندار کے ساتھ حسن سلوک میں اجر ہے۔"

درخت لگانا آپ کو بہت پسند تھا۔ اسے ثواب کا کام فرماتے تھے۔ ایک حدیث میں ہے کہ "جس مسلمان نے کوئی درخت لگایا اور اس کے پھل کسی جانور یا انسان نے کھائے تو یہ لگانے والے کے صدقہ ہو گا۔"

اپنی اولاد سے آپ بے انتہا محبت کرتے تھے۔ حضرت انس راوی ہیں کہ "میں نے کسی کو اپنے خاندان سے اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنی کہ آپ فرماتے تھے۔"

اپنے نواسوں یعنی حضرت حسنینؓ رضی اللہ عنہما کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ "یہ میرے گلدستے ہیں۔" ایک بار آپ حضرت امام حسینؓ کا منھ چوم رہے تھے۔ یہ دیکھ کر اقرع بن حابس نے کہا کہ "میرے دس بچے ہیں مگر میں نے تو آج تک کسی کا منھ نہیں چوما۔" آپ نے ارشاد فرمایا جو دوسروں پر رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔"

جو واقعات اس جزء میں بیان کیے گئے ان کی حیثیت محض مثال اور نمونہ کی ہے ورنہ آپ کی اخلاقی خوبیاں تفصیل سے بیان کرنے کیلئے بلا مبالغہ سیکڑوں اور ہزاروں اوراق درکار ہیں۔

چھٹا مقالہ

پیغمبر اسلام اور تلوار

لا اِکرَاہَ فِي الدِّینِ

(دین میں کوئی زبردستی نہیں)

کبھی ایسا نہیں ہوا کہ روشنی کی کوئی کرن پھوٹی ہو اور تاریکی نے اسے نگل جانے کی کوشش نہ کی ہو۔ دراصل کسی نئے تخیل یا تحریک کا جھٹلایا نہ جانا اور اس کی مخالفت نہ ہونا اس کی ناقابل تردید صداقت کی دلیل نہیں بسا اوقات اسکے پوچ اور لچر ہونے کا ثبوت ہوتا ہے۔

نور و ظلمت کی یہ کشمکش ابدی ہے — اس کشمکش میں — خواہ اس کا تعلق خود اپنے نفس و ضمیر سے ہو یا گرد و پیش کے ماحول اور کل انسانی دنیا سے ۔ نور کی حمایت اور ظلمت کی مخالفت میں اپنے امکان بھر حصّہ لینا، کوشش کرنا اور ہر طرح کے ایثار کے لئے تیار رہنا ہر مسلمان پر فرض ہے — اس فرض کو اسلامی اصطلاح میں جہاد کہتے ہیں۔

اسلام ویسے تو ابتدا ہی سے مختلف غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کا نشانہ رہا ہے لیکن اس کی جس چیز نے معترضوں کی جبینوں پر سب سے زیادہ شکنیں ڈالی ہیں اور انکی زبانوں اور قلموں کی جنبش میں لانے کا قوی ترین سبب ہوئی ہے وہ یہی جہاد کا تصور ہے۔ اکثر غیر مسلم حلقوں میں اس بات کو باور کرنے کا شعوری یا غیر شعوری رجحان پایا جاتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں تلوار لے کر اپنے دین کی تبلیغ کی اور یہ کہ آپ کی دینی جد و جہد درحقیقت ملک گیری وجہانبانی کا ایک بہانہ تھی جو وقت کے مزاج کے مطابق ہونے کے باعث اپنے اصل مقصد میں خوب کامیاب ہوئی، چنانچہ "دی نیو ایجوکیٹر انسائیکلوپیڈیا" (THE NEW EDUCATOR'S ENCYLOPAEDIA) جیسی اہم اور مستند کتاب بھی اس بے بنیاد بیان کی حامل ہے کہ جب "محمدؐ کے پیرووں کی تعداد میں کافی اضافہ ہو گیا تو انھوں نے اپنے عقائد بزور شمشیر منوانے کی ٹھانی (اور) جنگوں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ (بالآخر انھوں نے) پورا ملک عرب فتح کر ڈالا[۱]۔

یہاں جہاد کے نظریہ کی تھوڑی سی تشریح ضروری ہے۔ جہاد کے معنی عموماً جنگ اور قتال کے سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ اسکے اصلی معنی محنت اور کوشش کے ہیں۔ جہاد کا اصطلاحی مفہوم بیان کرتے ہوئے علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ:- "حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لئے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اسکے

---

[۱] صفحہ ۲۳۷۵

لئے اپنی، اپنے عزیز و قریب کے اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لئے جنگ کے میدان میں، اگر ان سے لڑنا پڑے تو اسکے لئے بھی پوری طرح تیار رہنا۔"[1]

تاریخ سے ذرا بھی رسم و راہ رکھنے والوں کو غالباً اس حقیقت کا اعتراف کرنے میں دشواری نہ ہو کہ کوئی تحریک محض اپنے پیغام کی حقانیت یا اصولوں کی پاکیزگی کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پیچھے عیش و آرام اور جان و مال کو داؤں پر لگا دینے والوں کی ایک جماعت نہ ہو، اگرچہ یہ درست ہے کہ کسی تحریک کی کامیابی اسکی صداقت اور افضلیت کا ثبوت نہیں ہے، مبارک سے مبارک تحریک کامیابی کا منھ اپنے پیروؤں میں مجاہدانہ ذوق پیدا کئے بغیر نہیں دیکھ سکتی۔

فطرت کا یہ راز دنیا نے آنحضرت صلعم ہی کی وساطت سے جانا اور آپ ہی کی بدولت آپ کی امت میں اعلیٰ مقاصد کی خاطر مادی سود و زیاں سے گذر جانے کا حوصلہ پیدا ہوا۔ یہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ہی کے تصوّرات تھے جنھوں نے مسلمانوں کو مکّہ میں سخت ترین مظالم کو برداشت کرنے کا کلیجہ عطا کیا۔ وہ تپتی ہوئی ریگ پر لٹائے گئے، ان کے جسم دہکتے ہوئے لوہے سے داغے گئے، ان کے گلوں پر تلواریں چلیں، تیروں کی ان پر بارش ہوئی، بھوک اور پیاس سے آزمائے گئے مگر ان کے عزم و استقلال میں ترقی ہی ہوتی گئی، پھر وطن اور عزیز و اقارب سے منھ موڑ کر حبش اور مدینہ کا رخ کرنا پڑا تو کسی کے پائے ثبات کو لغزش نہ ہوئی۔ دورِ نبوت کے آخری دس سال مسلمانوں نے جس طرح تلواروں کے سایہ میں بسر کئے وہ بھی تاریخ میں

---

[1] سیرۃ النبی ج ۵ ص ۳۹۶

ہمیشہ یادگار رہیں گے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے جہاد کے معنی صرف تیر و تفنگ ہی کے ذریعہ کوشش کرنے کے نہیں ہیں، بلکہ تمام نیک کاموں کے لئے تمام جائز طریقوں سے سعی کرنا اسکے تحت میں داخل ہے۔ چنانچہ خود اپنے نفس کے خلاف سعی کرنے کو سب سے بڑا جہاد بتایا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ ایک بار آنحضرت صلعم نے میدان جنگ سے لوٹ کر آنے والے صحابہ کا ان الفاظ سے استقبال کیا کہ "تمھارا آنا مبارک! تم چھوٹے جہاد (جنگ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو۔ بڑا جہاد بندے کا اپنے نفس سے لڑنا ہے" ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ "بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنی خواہشوں سے جہاد کرو"[ل]

اسی طرح تحصیل علم بھی ایک جہاد ہے، کیونکہ اس سے ظلمت کی پسپائی ہوتی ہے۔ جو ایمان کی سب سے بڑی دشمن ہے۔ بعض علماء نے تو اس جہاد کو جہاد بالنفس اور جہاد بالمال پر ترجیح دی ہے۔ اسلام کی عظیم الشان ترقی کا راز دراصل "قرآن اور تلوار" میں نہیں بلکہ قرآن کی تلوار میں تلاش کرنا چاہیئے۔

فلا تطع الکافرین وجاھدھُم	"تو کافروں کی باتوں میں نہ آ
بہٖ جھادًا کبیرًا ہ	اور قرآن کے ذریعہ ان سے جہاد
	کر، بڑا جہاد" (القرآن۔ فرقان)

اور ظلم، افلاس، بیماری، توہم پرستی، عصبیت اور تمام دوسرے جسمانی و اخلاقی و روحانی مصائب و معائب کے خلاف محنت و سعی بلیغ جہاد کا مرتبہ رکھتی ہے۔

ل ماخوذ از سیرۃ النبی جلد ۵، صفحہ ۴۰۰

ایک ارشاد نبوی یہ بھی ہے کہ "ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے انصاف کی بات کہہ دینا ہے[1]"۔

ایک صحابی یمن سے سفر کر کے مدینہ آئے اور دربارِ رسالت میں حاضر ہو کر لشکرِ اسلام میں شامل کئے جانے کی خواہش کی۔ آپ نے ان سے دریافت فرمایا "تمھارے والدین زندہ ہیں یا فوت ہو گئے؟" انھوں نے بتایا کہ زندہ تھے۔ ارشاد ہوا "تو پھر تم ان ہی کی خدمت میں جہاد کرو[2]"۔ گویا خدمتِ والدین بھی جہاد ہے۔

عورتوں نے ایک بار جہاد میں شرکت کی اجازت مانگی تو انھیں جواب ملا کہ تمھارا جہاد نیک حج ہے[3]۔

زندگی نرم بھی ہے اور گرم بھی، یا شاعری کی زبان میں "شاخِ گل بھی ہے اور "تلوار" بھی۔ انسان کو نرم و گرم دونوں قسم کے اخلاق کی حاجت ہے۔ حلم اور رحم، صبر اور ضبط، عفو اور درگذر بڑی خوبصورت صفتیں ہیں مگر زندگی کے ہر نشیب و فراز میں تو یہ دستگیری نہیں کر سکتیں۔

فراوڈے (FROUDE) نے خوب کہا ہے کہ "تحمل اپنی جگہ پر ایک اچھی چیز ہے لیکن تم اسکو تو برداشت نہیں کر سکتے جو تم کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے اور تمھاری گردن قلم کر دینے کی کوشش میں لگا ہوا ہے"۔

پھر یہ ضروری نہیں ہے کہ ضبط و تحمل کے پیچھے ہمیشہ عقل و شرافت ہی کے عناصر ہوں۔ یہ کیفیات مختلف دماغی و اخلاقی عوامل کے نتیجہ میں پیدا ہو سکتی ہیں۔ گبن (GIBBON) نے اس پہلو پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "ایک تحمل فلاسفر کا ہے

---

[1] ترمذی [2] ابو داؤد [3] صحیح بخاری

جس کے نزدیک تمام مذاہب یکساں سچے ہیں، دوسرا مورخ کا ہے جس کی نظر میں سب یکساں جھوٹے ہیں، تیسرا سیاست داں کا ہے جو کل کو یکساں مفید سمجھتا ہے، ایک تحمل اس شخص کا ہے جو مختلف نظریوں اور طریقوں کو اس بنا پر برداشت کرتا ہے کہ وہ خود تمام نظریوں اور طریقوں سے مطلق بے نیاز ہو چکا ہے۔ پھر ایک تحمل اس کمزور آدمی کا بھی ہے جو اپنی کمزوری کے باعث ان بزرگوں یا باتوں کی ہر طرح کی توہین و تحقیر برداشت کرنے پر مجبور ہے جنھیں وہ بہت عزیز رکھتا ہے۔"

چنانچہ نرم اخلاق نہ تو ہر حال میں کریم النفسی کا پرتو ہیں اور نہ ہی تمام موقعوں پر زندگی کی باگ ڈور ان کے حوالے کی جاسکتی ہے۔ مشہور انگریز مفکر ہابس (HOBBES) کی رائے میں فطرت کا اولین قانون یہ ہے کہ امن کو تلاش کیا جائے اور اس کی راہ پر چلا جائے اور دوسرا جو کہ فطرت صالحہ کا خلاصہ ہے یہ کہ ہر ممکن طرح سے ہم اپنی حفاظت کریں۔"

اسی نقطۂ نظر کی حمایت میں آسٹریلوی مُدبّر آر، جی، کیسے (R.G CASEY) نے اپنی کتاب "این آسٹریلین اِن انڈیا" (AN AUSTRALIAN IN INDIA) میں گاندھی جی کے تصوّر عدم تشدد پر تنقید کرتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ یہ تو میری سمجھ میں آسکتا ہے کہ میں دوسروں کیخلاف تشدد نہ اختیار کروں، لیکن دوسروں کو میں اپنے خلاف تشدد اختیار کرنے سے کیسے باز رکھ سکتا ہوں؟ یعنی دوسرے الفاظ میں عدم تشدّد کا نظریہ ایک ناکافی اور نامکمل نظریہ ہے اور اس کے سانچے پر افراد یا اقوام کی زندگیوں کو نہیں ڈھالا جاسکتا۔

ہر فرد اور ہر جماعت کی زندگی میں کچھ مواقع ایسے آتے ہیں کہ اسے حلم، عفو اور اِمتنا

کے علاوہ ان کے برعکس اخلاقی اوصاف کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سقراط سے ایک بار دریافت کیا گیا کہ "کیا انسان کو جنگوں سے نجات نہ مل سکے گی؟" تو اس نے جواب میں کہا کہ "جنگیں اس وقت تک ناگزیر رہیں گی جب تک انسان دیوانگی میں مبتلا رہیگا۔" اس پر لوگوں نے سوال کیا "اور انسان کب تک دیوانگی میں مبتلا رہے گا؟" سقراط نے کہا "ہمیشہ۔"

خواجہ کمال الدین نے "آئیڈیل پرافٹ" (THE IDEAL PROPHET) میں لکھا ہے کہ ــــ مذاہب اور ممالک کی تواریخ سے یکساں طور معلوم ہوتا ہے کہ تلوار کو کبھی بالائے طاق نہیں رکھا گیا ہے۔ ہندو اوتاروں اور اسرائیلی سرداروں نے اسے بے نیام کیا کیونکہ نہ تو اسرائیلی قانون اور نہ ہندو دھرم کسی معنوں میں اہنسا کا پرچار کرتا ہے امن کے شاہزادہ کا بھی یہی اعلان تھا کہ وہ دنیا کو امن نہیں بلکہ تلوار دینے آیا تھا۔ وہ قانون اور پیغمبروں (کے کاموں) کو پورا کرنے آیا تھا۔ اس کے مذہب کے اصول تلوار کے استعمال کی اجازت دیتے تھے اور اس کے سلسلہ کے پیغمبروں نے جنگیں لڑی تھیں۔ درحقیقت وہ تلوار ضرور اٹھاتا اگر مناسب اور موافق موقع پیش آتا۔ مگر ایسا نہ ہوا اور اگر اس نے پطرس کو تلوار بے نیام کرنے سے باز رکھا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ وقت نامناسب تھا اور تشدد کے استعمال سے اس کو اور اس کے پیروں کو زیادہ نقصان پہنچ جاتا۔ اسکے علاوہ جو حضرت عیسیٰ خود نہ کر سکے وہ ان کے پیروں نے پوری مستعدی اور تندہی سے کر ڈالا ہے، اور اس طرح ان کے الفاظ کی صداقت خطرناک انداز میں ثابت کر رہے ہیں۔ مسیحیہ (کرائسٹڈم) کے مادی اور ذہنی وسائل کا بہت بڑا حصہ ان ذرائع کی ایجاد میں صرف ہو رہا ہے جو ساری دنیا کو بہترین طور پر آگ اور تلوار کے حوالے کر سکیں۔"

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کو تلوار کا صحیح استعمال بتایا۔ بعض صورتیں یقیناً ایسی ہوتی ہیں جن میں ہتھیار اٹھانا ایک اخلاقی ضرورت بن جاتا ہے۔ مثلاً جب آزادی پر چوطرفہ حملے ہونے لگیں یا عبادت گاہیں خطرہ میں پڑ جائیں یا ابن آدم کی آبرو اور جان اور مال کی کوئی قیمت نہ رہ جائے تو محض تماشائی بن کر تو نہیں دیکھا جا سکتا لیکن بدقسمتی سے اکثر تلوار کا استعمال غلط ہی ہوا ہے۔ خدا کے رسول کا اس طرح یہ فرض تھا کہ وہ امن اور جنگ کے موقعوں کو الگ الگ کر کے دکھائے اور دنیا کی ہدایت کے لئے میدان جنگ کے اخلاقیات کا بھی ایک مکمل اور جامع دستور العمل بہم پہنچائے۔

(٢)

اسلام نے حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لئے جنگ کرنا جائز قرار دیا ہے اور آنحضرت صلعم کو بھی مجبور ہو کر تلوار سے کام لینا پڑا، مگر اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ اسلام کی کامیابی کی کہانی درحقیقت جنگ وجبر کی کہانی ہے اور لشکر کشی کا اصل مقصد یہ تھا کہ دین کی آڑ لے کر سلطنت وحکومت کی ہوس پوری کی جائے محض بہتان اور تاریخ کو جھٹلانے کی ایک گندی سازش ہے۔

اسلام ایک استدلالی اور عقلی مذہب ہے، اسکے تبلیغ ودعوت کے اصول حکمت اور دانشمندی، وعظ اور نصیحت اور بحث ومباحثہ پر قائم ہیں۔ پیغمبر اسلام پر جو صحیفۂ ربانی نازل ہوا اس نے عقل انسانی کو مخاطب کیا اور غور وفکر وفہم وتدبر کی دعوت دی۔ پھر جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے دعوت اور تبلیغ کا راستہ اختیار کرتا ہو اور سوچنے اور سمجھنے کا لوگوں سے مطالبہ کرتا ہو وہ کیونکر جبر اور زبردستی کی تدبیریں

کام میں لا سکتا ہے؟ اسلام نے صرف یہی نہیں کیا کہ دین کی جبری اشاعت کی مذمت کی بلکہ اس نے یہ نکتہ بھی سمجھایا کہ مذہب رضا و رغبت کی چیز ہے۔ اس کا تعلق قلب و روح سے ہے اور قلب و روح کو بزور شمشیر تسخیر نہیں کیا جا سکتا۔ ایمان دراصل یقین کا دوسرا نام ہے۔ دنیا کی زبردست سے زبردست طاقت جبراً کسی کمزور سے کمزور انسان کے دل میں بھی یقین کا ایک ذرّہ نہیں پیدا کر سکتی۔

وَقُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ	"اور کہدے کہ حق تمھارے پروردگار
فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ	کی طرف سے ہے تو جو چاہے قبول کرے
فَلْيَكْفُرْ (سورۂ کہف)	اور جو چاہے انکار کرے۔"
لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ	"دین میں کوئی زبردستی نہیں
قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ	حقیقت گمراہی سے الگ ہو چکی
الْغَيِّ (سورۂ بقرہ)	....

نبی کا کام لوگوں کو حقیقت سے روشناس کرا دینا ہے۔ اسکو زبردستی منوانا نہیں۔

اِنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ	ہمارے نبی پر یہی فرض ہے کہ وہ صاف
الْمُبِيْنُ (مائدہ)	صاف ہمارا پیغام پہنچا دے۔"
اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ	"اے پیغمبر تو صرف نصیحت کرنے والا
عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (غاشیہ)	ہے تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔"
فَاِنْ اَعْرَضُوْا فَمَآ اَرْسَلْنٰكَ	"پھر اگر وہ اسلام سے انکار کریں تو اے
عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا اِنْ عَلَيْكَ	پیغمبر ہم نے تجھ کو ان پر گماشتہ بنا کر نہیں
اِلَّا الْبَلٰغُ (شوریٰ)	بھیجا۔ تیرے ذمہ صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے۔"

اگر خدا کو دین کی بہ جبر اشاعت ہی منظور ہوتی تو وہ یقیناً اس پر قادر تھا کہ تمام لوگوں کو مسلمان بنا دیتا لیکن اس کی حکمت اور مصلحت یہ ہے کہ اس کے بندوں کو مذہب کے معاملہ میں پوری آزادی ہو اور عقل اور بصیرت والے چشمۂ نور سے فیضیاب ہوں اور نافہم محروم رہیں۔

وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ	"اگر تیرا پروردگار چاہتا کہ (لوگوں کو
فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا	زبردستی مومن بنا دے) تو زمین کے سب
اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی	لوگ ایمان لے آتے تو کیا پیغمبر تو لوگوں پر
یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ (یونس)	زبردستی کریگا کہ وہ ایمان لے آئیں۔

قرآن مجید میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم دیا گیا ہو۔ قرآن کی ہدایت اس کے بالکل برعکس ہے۔

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ	"اور اگر (لڑائی میں) کوئی مشرک تجھ سے
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰی یَسْمَعَ	پناہ کا طالب ہو تو اس کو پناہ دے یہاں
كَلَامَ اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ	تک کہ وہ خدا کا کلام سن لے پھر اس کو
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا یَعْلَمُوْنَ	وہاں پہنچا دے کہ جہاں وہ بالکل بےخوف
(توبہ)	ہو کر رہ سکے کہ یہ لوگ بے علم ہیں۔"

اور نہ آنحضرت صلعم کی سیرت ہی میں کوئی واقعہ ایسا ملتا ہے جو دین کی جبری اشاعت کی طرف اشارہ کرتا ہو۔ اس کے برخلاف نرمی، حسن خلق، صداقت و سخاوت عفو و حلم کے ذریعے پتھر کو موم بنا دینے کے لاتعداد واقعات البتہ آپ کے صحیفۂ حیات کے تمام اوراق میں بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔

مثلاً غزوۂ خیبر کے دوران میں جب آپ نے علَم خاص حضرت علیؓ کو عنایت فرمایا تھا تو انھوں نے دریافت کیا کہ "کیا یہودیوں کو لڑکر مسلمان بنالیں"۔ آپ نے فرمایا "نرمی کے ساتھ ان کے سامنے اسلام پیش کرو، اگر ایک شخص بھی تمھاری ہدایت پر ایمان لے آئے تو یہ سرخ اونٹوں سے بہتر ہے"۔

اسی طرح جب فتح مکہ کے بعد آپ نے حضرت خالد کو بنو جذیمہ کی طرف بھیجا تو صاف ہدایت کردی تھی کہ صرف دعوت دین مقصود ہے جنگ نہیں۔ اور جب اس کے باوجود حضرت خالد نے تلوار سے کام لیا تو آپ نے سخت ناپسند کیا اور قبلہ رو کھڑے ہو کر فرمایا کہ "اے خدا! خالد نے جو کچھ کیا اس کی ذمہ داری مجھ پر نہیں ہے"۔ پھر آپ نے خون بہا ادا کرنے کے لئے حضرت علی کو روانہ فرمایا اور انھوں نے ایک ایک بچہ کا یہاں تک کہ کتوں کا بھی خوں بہا ادا کیا۔[۱]

اسلام اور تلوار کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے لکھا ہے کہ "محمد (صلعم) کے تلوار کے زور سے اپنے دین کی اشاعت کرنے کا بہت چرچا کیا گیا ہے ۔۔۔۔ تلوار بیشک، مگر تم کو تلوار ملے گی کہاں؟ ہر نیا خیال اپنی ابتدائی منزل میں ایک کی اقلیت میں ہوتا ہے۔ وہ صرف ایک ہی شخص کے ذہن میں نشو ونما پاتا ہے۔ دنیا بھر میں صرف ایک ہی شخص اس پر یقین رکھتا ہے اور تنہا وہ ایک شخص تمام اشخاص کے مقابل ہوتا ہے۔ اس شخص کا تلوار ہاتھ میں لے کر اسکی اشاعت کرنے لگنا کچھ بھی مفید نہ ہو سکے گا۔[۲]

قتل وغارت، خونریزی اور بدامنی سے زیادہ خدا کو کوئی چیز ناپسند نہیں ہے

۱؎ تاریخ طبری، جلد ۳ ۲؎ آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ صفحہ ۶۱

قرآن کی تعلیم کے مطابق رسول کی بعثت کا ایک خاص مقصد دنیا میں امن و امان کا قیام اور جان و مال اور آبرو کی حفاظت کا انتظام بھی تھا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِى الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا (مائدہ)

"اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل کو لکھ دیا تھا کہ جس شخص نے ایک جان کو بغیر بدلے یا زمین میں فساد کے قتل کیا اس نے گویا سارے عالم کو قتل کر ڈالا۔"

وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِى الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ۔ (بقرہ)

"اور جب وہ پھر کر جاتا ہے تو کوشش کرتا ہے کہ زمین میں فساد برپا کرے اور کھیتی اور نسل برباد کرے اور اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔"

وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل)

"خدا نے جس جان کو حرام کیا ہے اس کو ناحق نہ مارو۔"

اسلام میں نیک و بد کی تشخیص صرف علم و عقیدہ تک محدود نہیں ہے۔ وہ بدی کے استیصال اور نیکی کی نصرت کی خاطر عملی جد و جہد کا بھی مطالبہ کرتا ہے اس کی تدبیریں بتاتا ہے اور اس سلسلے میں احکام صادر کرتا ہے۔ اسلام کا عملی اسلوب فکر انسانی کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہ کمزوریاں ہمیشہ صرف پند و نصیحت ہی کے ذریعہ مٹائی یا دبائی نہیں جا سکتی ہیں بعض اوقات امن کا مقصد بھی جنگ کے بغیر حاصل نہیں ہوتا ہے، چنانچہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بھی ایسے مواقع آئے۔ جب تلقین و وعظ کے ساتھ زور بازو سے بھی کام لینا ناگزیر ہو گیا، اور اگر ان صورتوں میں بھی آپ خونریزی سے احتراز فرماتے تو دنیا کے لئے ایک ایسی مثال چھوڑ جاتے جس پر اول تو عمل کرنا ممکن ہی نہ ہوتا اور اگر بفرض محال وہ عامل ہو بھی جاتی تو چند ہی صدیوں میں اسکی شکل ایسی مسخ ہو جاتی کہ تہذیب و تمدن کا نکھار ڈھونڈھنے پر بھی نظر نہ آتا۔

اسلام جنگ کی اجازت دیتا ہے مگر صرف عمل جراحت کے طور پر یعنی ایک ایسی رکاوٹ کو دور کرنے کی غرض سے جو معمولی تدابیر سے دفع نہ ہو سکے۔ گویا جنگ ایک ناپسندیدہ ضرورت ہے۔ ایک بلند اور مستحسن مقصد کے حصول کی آخری تدبیر۔ اس طرح اسلام جنگ کو بہیمانہ کشت و خون کی سطح سے اٹھا کر عبادت کے مقام پر پہنچا دیتا ہے جو جنگ اس عظیم اور ارفع معیار پر نہ آسکے۔ وہ سراسر قابل نفرت اور رسوائی کا باعث ہے۔

(۳)

جنگ تمام انسانی افعال میں بلاشبہ سب سے زیادہ بہیمانہ فعل ہے۔ جنگ کے میدان میں انسان اپنی اشرف المخلوقات کی خلعت اتار کر رکھ دیتا ہے اور جنگلی درندوں کا جامہ پہن لیتا ہے، لیکن چونکہ آنحضرت صلعم ایک مقدس فرض ہی کے طور پر تلوار اٹھانا جائز سمجھتے تھے اس لئے آپنے تمام وحشیانہ طریقوں کی ممانعت کر دی اور ایسی اصلاحیں جاری فرمائیں کہ سفاکی، بیدردی اور درندگی کی جگہ عدل، رحم کے جذبات میدان جنگ کے بھی اوصاف بن گئے۔

اچانک حملہ کر بیٹھنا یا حملہ آوری میں پیش دستی اختیار کرنا جنگی قیادت کا بہترین عنصر زمانہ قدیم میں سمجھا جاتا تھا اور آج بھی سمجھا جاتا ہے لیکن آنحضرت صلعم

کا دستور اس کے خلاف تھا اور اس میں آپ کی مصلحت صرف یہی نہیں تھی کہ مسلمانوں پر میدانِ جنگ میں پیش قدمی کرنے کا الزام نہ آنے پائے بلکہ اس سے کہیں زیادہ اہم یہ نکتہ بھی ملحوظ ہوتا تھا کہ دشمن کو جنگ و امن کے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرنے کا زیادہ سے زیادہ موقع ملے اور آخری لمحہ میں بھی وہ صلح کو جنگ پر ترجیح دینا چاہے تو کوئی چیز مانع نہ ہو۔

چنانچہ جن غزوات میں اسلامی افواج کی قیادت آپ خود فرما رہے ہوتے تھے ان میں میدان جنگ میں صفیں آراستہ کرنے کے بعد آپ کل مجاہدین کو صاف حکم دیدیتے تھے کہ جب تک دشمن کی فوجیں بالکل قریب نہ آجائیں اپنی جگہ سے کوئی نہ بڑھے، اور جن مہموں میں آپ خود شریک نہ ہوتے تھے ان میں بھی افواج کو رخصت کرتے وقت آپ اسی قسم کی ہدایات فرمادیا کرتے تھے۔ مثلاً سنہ ۱۰ھ میں حضرت علی تین سو سواروں کے ساتھ عازم یمن ہوئے تو رسول اللہ صلعم نے ان سے فرمایا کہ "جب تم وہاں پہنچ جاؤ تو جب تک کوئی تم پر حملہ نہ کرے تم نہ لڑنا"[1] اسی طرح حضرت معاذ بن انس سے روایت ہے کہ میں فلاں غزوہ میں آپ کے ساتھ تھا، لوگوں نے دوسروں کے پڑاؤ پر جا کر تنگ کیا اور لوٹا مارا۔ آپ نے ایک شخص کو بھیجا جس نے منادی کر دی کہ جو دوسروں کو ان کے گھروں میں تنگ کرے یا لوٹے مارے اس کا جہاد قبول نہیں[2]۔

یہ ایک پرانا مقولہ ہے کہ جنگ اور محبت میں سب کچھ جائز ہے مگر جس کا فرض زندگی کے ہر شعبہ میں جائز و ناجائز کی دائمی تحدید ہو اس کی نظر میں اس طرح کے شاعرانہ مقولے کچھ وقعت نہیں پا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلعم نے جنگ میں ضعیفوں

---

[1] ماخوذ از سیرۃ النبی جلد اول صفحہ ۶۰۵ [2] ایضاً صفحہ ۶۱۲

عورتوں، بچّوں، ملازموں اور غلاموں کے قتل کی قطعی ممانعت کردی تھی اور جب
مسلمانوں کی فوجیں غنیم کی آبادیوں میں داخل ہوتی تھیں تو انھیں عام طور پر یہ حکم دے
دیا جاتا تھا کہ جو لوگ اپنے گھروں میں بیٹھے رہیں یا کسی اور طریقہ سے مقابلہ میں آنے
کا ارادہ ظاہر کردیں انہیں مکمل امان دیا جائے۔

اسی طرح خلیفۂ اول حضرت ابوبکر نے بھی جب شام کی طرف فوج روانہ کی تو
اسکے نام یہ تاریخی فرمان جاری کیا کہ "دشمنوں سے تمھارے معاہدوں میں جھوٹ یا
فریب نہ ہونا چاہیے، ہر معاملہ میں ایمان دار رہو تاکہ تمھاری صداقت اور اعلیٰ ظرفی
ثابت ہو جائے۔ اپنے وعدوں اور اپنی باتوں کی سختی کے ساتھ پابندی کرو۔
راہبوں اور سنیاسیوں کے سکون میں خلل نہ ڈالو اور ان کے مسکنوں کو مسمار نہ ہونے دو۔"[۱]

اس فرمان کے متعلق مشہور انگیز مصنف باسورتھا سمتھ (BOSWORTH
SMITH) تحریر کرتے ہیں کہ "ابوبکر نے شام میں اپنی فوجوں کو حکم دیدیا تھا کہ
نہ تو مردوں کے چہرے بگاڑیں، نہ بڈھوں، عورتوں اور بچّوں کو قتل کریں۔ نہ پھلدار
درختوں کو گرائیں اور ان کے جانوروں کو ماریں علاوہ اسکے کہ کھانے کے لئے ضرورت
ہو، اور ان کریمانہ اصولوں نے مسلمانوں کی ساری جنگی تاریخ میں جنگی ضوابط کا
کام دیا۔"[۲]

اور فنلے (FINLAY) نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ "اس نے یہودیوں

---

[۱] طبری، ج ۲

[۲] ماخوذ از اسلام اینڈ سولائزیشن (ISLAM AND CIVILISATION) مصنفہ خواجہ کمال الدین، ص ۷۵

اور عیسائیوں کو انصاف وحلم اور بردباری کے ایسے اصولوں کا مژدہ سنایا جن پر نہ تو رومی شہنشاہوں اور نہ سخت عقیدہ پادریوں اور پوپوں نے کبھی عمل کیا تھا۔"[1]

یہاں ایک نظر دشمنوں کے ساتھ سلوک کے اس انداز پر بھی ڈال لینا چاہیئے جس کی تعلیم یہود کی شریعت میں پائی جاتی ہے اور جس پر ان کا عمل تھا۔ کتاب توراۃ کے باب متی کی یہ سطریں ملاحظہ ہوں:۔

"بنی اسرائیل نے مدیان کی عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لیا۔ ان کے مویشی اور بھیڑ بکری اور مال ومتاع سب لوٹ لیا اور ان کے سارے شہروں کو جن میں وہ رہتے تھے اور ان کے تمام قلعوں کو پھونک دیا۔" (۹ - ۳۱)

"تم ان کے کل بچوں کو قتل کر دو اور ہر عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہے جان سے مار دو۔" (۱۸ - ۳۱)

"لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں، ان کو اپنے لئے زندہ رکھو۔" (۱۹ - ۳۱)

نیز ہندوؤں کی مقدس کتاب رگ وید کے ان چند اقتباسات کا مطالعہ بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

"اس نے پچاس ہزار سیاہ فام دشمنوں کو لڑائی میں موت کے گھاٹ اتارا۔" (منڈل ۴ - منتر ۱۶)

"ہم نے داسوں (غلاموں) کے جسموں کو دو حصوں میں قطع کر ڈالا۔ قضاوقدر نے ان کو اسی لئے پیدا کیا تھا۔" (منڈل ۱۰ - منتر ۴۹)

---

[1] فنلے۔ گریس انڈر دا رومنس صفحہ ۳۶۸ (GREECE UNDER THE ROMANS)

وہ اندرا جس نے دِرتِرا کو قتل کیا اور قصبے کے قصبے اور گاؤں کے گاؤں تہ و بالا کر ڈالے۔" (منڈل ۲-منتر ۲۰)

اسیرانِ جنگ پر ظلم کے پہاڑ توڑنا اس زمانہ کی تمام قوموں میں ایک معمولی بات تھی۔ عرب بھی اس میں کسی سے پیچھے نہ تھے۔ آنحضرت صلعم نے ان کی بابت تاکید کی کہ عزّت و عافیت کے ساتھ رکھے جائیں۔

مسلمانوں کو سب سے پہلے جنگِ بدر میں قیدی ہاتھ آئے تھے۔ یہ لوگ اہلِ مکہ تھے اور ان کی اسلام دشمنی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی، ان میں بہت سے ایسے تھے جنھوں نے اپنے ہاتھ اور زبان سے خود رسول اللہ صلعم اور اکثر اکابر کو مختلف قسم کی اذیتیں پہنچائی تھیں۔ چنانچہ آپ نے مناسب جانا کہ ان کے معاملہ میں صحابہ سے مشورہ کر لیا جائے۔ صحابہ میں رائے کا اختلاف ہوا۔ ایک گروہ حضرت ابوبکر صدیق کا ہمخیال تھا جن کی رائے تھی کہ قیدیوں کو جرمانہ لے کر آزاد کر دیا جائے۔ مسلمانوں کو جنگی ساز و سامان کے لئے سرمایہ کی ضرورت تھی، جرمانہ کی رقم اس سلسلہ میں بہت مفید ہو سکتی تھی۔ اس کے علاوہ رہا ہونے کے بعد اکثر قیدیوں کے ایمان لے آنے کا بھی امکان تھا۔ صحابہ کا دوسرا گروہ حضرت عمر فاروق کی اس تجویز سے متفق تھا کہ کل قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے، کیونکہ وہ سب کے سب کفر اور شرک کے امام اور پیشوا تھے۔ نہ جانے کتنے مسلمانوں کا خون ان کی گردنوں پر تھا۔ اب موقع تھا کہ ان معصوم شہدار کا قصاص لیا جائے۔ حضرت ابوبکر کی رائے چونکہ نرم دلی پر مبنی تھی، اسلئے رحمۃ للعالمین کو وہی پسند آئی۔ آپ نے حکم دیا کہ قیدیوں میں سے جو جرمانہ ادا کر دیں وہ رہا کر دیئے جائیں اور جو مقدرت نہ رکھتے ہوں انھیں مدینہ

لے چلا جائے۔ مدینہ پہنچ کر جب یہ قیدی صحابہ کے حوالہ کئے گئے، تو آپ نے تاکید فرمادی کہ ان کو کھانے پینے یا کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انہی قیدیوں سے روایتیں ہیں کہ صحابہ خود کھجور وغیرہ کھا کر بسر کر لیتے تھے اور ان کو کھانا کھلاتے تھے۔

غزوۂ حنین میں چھ ہزار اسیر مسلمانوں کے قبضے میں آئے تھے۔ آپ نے ان سب کو بلامعاوضہ رہا فرمادیا اور ان کے پہننے کے لئے چھ ہزار جوڑے عنایت فرمائے۔ اسیرانِ جنگ کی غیر مشروط رہائی کا یہ کوئی تنہا واقعہ نہ تھا۔ سیرت پاک میں اس طرح کے متعدد واقعات ملتے ہیں۔

قاضی سلیمان منصور پوری کا کہنا ہے کہ احادیث کی کتابوں میں ایک واقعہ قیدیوں کے تبادلہ کا بھی پایا جاتا ہے[1]۔ گویا آپ نے چودہ سو برس قبل ایک ایسے معاملہ کو قابل عمل ثابت کر دیا تھا جس پر عمل پیرا ہونا آج کی مہذب ترین قوموں کے لئے دشوار ہو رہا ہے۔

دورانِ جنگ میں دشمن کے مال و اسباب کو لوٹنے کا رواج عام تھا۔ آنحضرت صلعم نے اسکو بھی ناجائز قرار دیا۔ ابوداؤد میں ایک انصاری سے روایت ہے کہ ہم لوگ ایک مہم پر گئے ہوئے تھے کہ تنگدستی کے ہاتھوں سخت پریشانی میں مبتلا ہو گئے۔ راستہ میں اتفاق سے بکریوں کا ایک ریوڑ نظر آیا تو سب لوگ بیتاب ہو کر اس پر ٹوٹ پڑے اور بکریاں لوٹ لیں۔ آنحضرت صلعم کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو آپ موقع پر تشریف لائے، اس وقت تک گوشت ہانڈیوں میں چڑھایا جا چکا تھا۔ آپ کے ہاتھ میں کمان تھی، اس سے آپنے ہانڈیاں الٹ دیں اور گوشت خاک میں مل گیا، پھر فرمایا

---

[1] رحمۃ للعالمین، جلد اول، صفحہ ۱۹۳

"لوٹ کے گوشت اور مردار گوشت میں کوئی فرق نہیں ہے"۔[1]

مفتوحہ ملک سے جو مال و دولت ہاتھ آتا تھا وہ فاتح کا حق سمجھا جاتا تھا اور عیش و عشرت کے چراغ روشن کرنے اور رقص و سرود کی محفلیں گرم کرنے کے کام میں لایا جاتا تھا اور دربار کے امراء اس سے حسب حیثیت مستفید ہوتے تھے۔ آپ نے بحکم خداوندی اس میں محتاجوں، بے بسوں اور لاوارثوں کے حقوق مقرر فرمائے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِنْ	"اور جان لو کہ جو کچھ تمھیں غنیمت میں
شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰہِ خُمُسَہٗ وَلِلرَّسُوْلِ	حاصل ہو اس کا پانچواں حصہ خدا کا ہے
وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی	اور رسول کا اور رشتہ داروں کا اور
وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ	یتیموں کا اور غریبوں اور مسافروں کا"۔

(الانفال)

---

(۴)

دنیا میں دلیری اور شجاعت اور جنگجوئی اور سپہ سالاری کے عظیم الشان کارناموں کی کمی نہیں ہے۔ تاریخ کے مختلف دوروں میں کرۂ ارض کے مختلف حصوں سے ایسی زلزلہ بردوش ہستیاں اٹھتی رہی ہیں جنھوں نے اپنی تلواروں کی نوکوں سے دنیا کے طبقے الٹ دیئے ہیں لیکن کیا کبھی ان کی فتح و نصرت کی بازگشت روح انسانی کے نہاں خانوں میں بھی سنی گئی ہے؟ کیا ان کی تلواریں اوہام اور خیالات فاسدہ کی بیڑیاں کاٹ کر تہذیب و معاشرت کا کوئی نیا خاکہ بھی پیش کر سکی ہیں؟ اور کیا کبھی کسی سکندر

---

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الجہاد۔

یا چنگیز یا نپولین کی قوتِ بازو کے صدقہ میں انسانیت کو اس کے قلب و روح کی سیاہی، ناپاکی اور زنگ آلودگی سے نجات مل سکی ہے؟

برخلاف اس کے انبیاء علیہم السلام کے پیش نظر ہمیشہ ہمارے باطن کی اصلاح رہی ہے، انھوں نے ہماری روحانی و اخلاقی خامیوں کے علاج بہم پہنچائے ہیں۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ تَن کی دنیا در اصل مَن کی دنیا ہی کا پرتو ہے اور جب تک انسانوں کے ادراک و احساس و اخلاق کو سنوارا نہ جائے اس کی خارجی دنیا کا سنورنا محال ہے۔

نبی اگر سر پر خود پہن کر اور تلوار ہاتھ میں لیکر میدان جنگ میں آتا بھی ہے تو اس کی مثال اس ماہر جراحت کی ہوتی ہے جو ہاتھ میں نشتر لے کر آپریشن کی میز کے پاس جاتا ہے۔

متعدد بار صحابۂ کرام نے یہ منظر خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ معرکۂ کارزار گرم ہے۔ تیروں کی بارش ہو رہی ہے، تلواریں چمک رہی ہیں، سر تن سے جدا ہو رہے ہیں اور رسول اللہ صلعم کا سر مبارک سجدۂ نیاز میں خم ہے۔ توکل کی سپر، دعاؤں کے تیر، یقین کی زرہ، صداقت کی شمشیر، یہ ہیں ایک نبی کے اسلحہ خانے کے اصلی آلاتِ حرب۔

یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ تمام غزوات میں ایک بار بھی آنحضرت صلعم کا دست مبارک خون آلود نہیں ہوا

(۵)

اب آیئے ایک نظر غزوات نبوی پر بھی ڈال لیجئے۔ آپ کے کُل غزوات اور سرایا کی تعداد، مشہور سیرت نگار نبوی قاضی سلیمان منصور پوری کی تحقیق کی رُو سے بیاسی ہے،

اوران میں سب طرفین کے مجموعی نقصانات کا جو نقشہ انھوں نے پیش کیا ہے، وہ حسب ذیل ہے[1]

نام فریق	اسیر	زخمی	مقتول	کل	کیفیت
مسلمان	۱	۱۲۷	۲۵۹	۳۸۷	ہر دو جانب کے زخمیوں کی تعداد قطعی نہیں ہے
مخالف	۶۵۶۴	—	۷۵۹	۷۳۲۳	اسیروں اور مقتولوں کی تعداد ان شاء اللہ صحیح ہے
میزان	۶۵۶۵	۱۲۷	۱۰۱۸	۷۷۱۰	

جن جنگوں کے مجموعی نقصانات کے اعداد و شمار یہ ہوں ان کی بابت یہ کہنا کہ عرب جیسے جنگجو اور رزم پیشہ ملک میں صدیوں پرانے مذہبی اعتقادات پر اسلام کے غالب آنے کا اصلی راز ان ہی میں پوشیدہ ہے کہاں تک قرین عقل و صداقت ہے؟

پھر اس پر بھی غور کیجیے کہ جنگیں کن حالات میں پیش آئیں اور کیا اسباب تھے جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تلوار اٹھانے پر مجبور کیا؟

صورت یہ تھی کہ مسلمانوں کے مدینہ ہجرت کر جانے کے بعد قریش مکہ اس حقیقت کو شدت سے محسوس کرتے رہے کہ اسلام کا وقتی طور پر ان کی سر زمین سے ہٹ جانا کسی طرح ان کے مذہبی عقاید و رسوم کی حفاظت و بقا کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر اسلام کو مدینہ میں جڑ پکڑنے کا موقع مل گیا تو رفتہ رفتہ اس کی شاخیں مکہ پر ضرور اپنا اثر ڈالیں گی اور پھر عرب میں جو سیاسی تفوق اور روحانی سرداری ان کو حاصل ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا، چنانچہ انھوں نے فیصلہ کیا کہ مسلمانوں کو ان کے نئے مسکن

---

[1] رحمۃ للعالمین ج ۲ ص ۲۶۷ - ۲۲۰

میں بھی سکون سے نہ بیٹھنے دیا جائے۔ وہ ایک طرف تو خود مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاریاں کرنے لگے اور دوسری طرف تمام قبائل عرب کو بھڑکایا کہ اگر یہ نیا گروہ کامیاب ہوگیا تو تم فنا ہو جاؤ گے۔

یہ واقعہ تو نظر سے گذر چکا ہوگا کہ جب بیعت عقبہ میں انصار آنحضرت صلعم کے ہاتھ پر بیعت کر رہے تھے تو ایک انصاری نے کہا تھا کہ "بھائیو! جانتے ہو کس چیز پر بیعت کر رہے ہو؟ یہ عرب و عجم میں اعلان جنگ ہے۔" گویا یہ حقیقت کسی سے چھپی نہ تھی کہ اسلامی مرکز کا مکہ سے مدینہ منتقل ہونا مشرکین عرب کے نزدیک ایک چیلنج تھا۔ چنانچہ ہجرت کے فوراً بعد ہی قریش نے مدینہ کے رئیس عبداللہ بن ابی کو کہلا بھیجا تھا کہ "محمدؐ کو مدینہ سے نکال دو، ورنہ ہم خود وہاں آکر تمھارا اور محمدؐ دونوں کا فیصلہ کردینگے۔"

اس صورت میں یہ لازمی تھا کہ مدینہ کی حفاظت کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ حفاظت کا حتی الامکان پورا انتظام نہ کرنا صرف اسلام کے وجود ہی کو خطرہ میں نہ ڈال دیتا بلکہ اہل مدینہ کے ساتھ بدعہدی کا بھی مرادف ہوتا اور پھر جو قلم آج نبی صلعم کے تلوار اٹھانے کے خلاف اوراق اور جلدیں سیاہ کر رہے ہیں آپ کے تلوار نہ اٹھانے پر نکتہ چینی کرتے ہوتے۔

ٹامس کارلائل (THOMAS CARLYLE) نے ان واقعات پر یوں تبصرہ کیا ہے:۔ "اب تک محمدؐ نے اپنے دین کی اشاعت صرف تبلیغ اور تلقین ہی کے ذریعہ کی تھی، لیکن اب بے رحمی کے ساتھ اپنے آبائی وطن سے نکال دیئے جانے کے بعد۔ جب کہ غیر منصف انسان نے صرف ان کے آسمانی پیغام اور ان کے

دل کی پکار کو سننے ہی سے انکار نہیں کر دیا تھا بلکہ اپنی بات پر قائم رہنے کی پاداش میں ان کے خون کا بھی پیاسا ہو گیا تھا۔ صحرا کے اس تہذیب ناآشنا فرزند نے ایک مرد اور ایک عرب کی طرح اپنے تحفظ کا ارادہ کیا۔"

---

[1] آن ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ، صفحہ ۱۶ (ON HEROES AND HERO WORSHIP)

ساتواں مقالہ

کامیاب ترین پیغمبرؐ

هُوَ الَّذِیْ اَیَّدَكَ بِنَصْرِهٖ

(خدا نے تیری تائید کی اپنی نصرت سے۔ (القرآن۔ انفال)

"پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) تمام پیغمبروں اور دینی رہنماؤں میں سب سے زیادہ کامیاب رہے"[1]

نبوت کا فریضہ دنیا کا سب سے مشکل فریضہ ہے۔ خدا کی شان کہ اس نے اس مشکل ترین کام میں سب سے زیادہ کامیابی اپنے اس بندے کو عطا کی جس کے پاس بظاہر کامیابی کے وسائل سب سے کم تھے۔

حضرت موسیٰ عیش و عشرت کے گہوارہ میں پلے تھے۔ حضرت عیسیٰ کی قوم اپنے عہد کی سب سے زیادہ مہذب اور ترقی یافتہ قوم تھی۔ لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، باب قرآن (ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA CHAP, KORAN)

کے حالات برعکس تھے۔ پیدا ہوئے تو یتیم، لڑکپن بکریاں چراتے گذرا۔ جوان ہونے پر فکرِ معاش ایسی دامنگیر ہوئی کہ ایک دن بھی اطمینان سے بیٹھنے کو نہ ملا۔ ان حالات میں نوشت و خواند کا کیا اہتمام ہوتا؟ لکھنے پڑھنے سے قطعاً ناواقف رہے۔ قوم ایسی ملی تھی جو اپنی گمراہی کو ہی عین آگہی سمجھتی تھی۔ پھر بھی آپ نے اللہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں وہ شاندار کامیابی حاصل کی جو آج تک آپ اپنی مثال ہے۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو فرمانروایانِ مصر کے ظلم سے نجات دلائی۔ آزادی اور عزت کی زندگی میسر کرائی۔ اسکے بدلہ میں بنی اسرائیل نے ان کے ساتھ احسان فراموشی کی انتہا کردی۔ اور خطرہ کے موقع پر یہ کہہ کر صاف الگ ہو گئے کہ "تم اور تمھارا خدا جاؤ اور لڑو، ہم یہیں رہیں گے"۔ حضرت عیسیٰ کے قریبی اعزا تک نے ان کی بات نہ سنی۔ خود ان کے بھائیوں نے ان کی نبوّت کی تردید[۱] کی اور ان کے خون کے پیاسے ہو گئے[۲]۔

حضرت عیسیٰ افسوس کے ساتھ فرمایا کرتے تھے کہ "یہ بات نہیں ہے کہ نبی کا احترام نہیں ہوتا۔ البتہ اس کے گھر اور اس کے ملک میں اس کی عزت نہیں ہوتی[۳]"۔ ان کی تشریف بری کے وقت ان کا کل سرمایۂ حیات گنتی کے چند پیرو تھے جن میں زیادہ تر دھوبی اور اسی قسم کے پسماندہ اور ناتعلیم یافتہ لوگ تھے۔

اور ایک حضرت عیسیٰ پر کیا موقوف حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی نبی کو اس کی زندگی میں اپنی کوششیں پوری طرح بارآور ہوتے دیکھنا

۱؎ انجیل ۔ ۲؎ مارک ۔ ۳؎ متی

نصیب نہیں ہوا۔ اگر کسی نبی کے گلستانِ آرزو میں بہار آئی بھی تو اس کی آنکھیں بند ہو چکنے کے بعد یہ مژدہ جانفزا صرف حضور ہی کے مقدر میں تھا کہ :۔

جَآءَ الحَقُّ وَزَھَقَ الْبَاطِلُ — حق آگیا اور باطل چلا گیا۔ باطل

اِنَّ البَاطِلَ کَانَ زَھُوْقاہ — تو جلنے ہی والا تھا۔

اور یہ چیز صرف حضور ہی کو نصیب ہوئی کہ آپ نے لوگوں کے دینِ حق میں فوج در فوج داخل ہونے کا منظر اپنی آنکھوں دیکھ لیا۔

اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ — جب آجائے خدا کی نصرت اور فتح

وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ — اور تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج خدا

فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا۔ — کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

عرب کی سرزمین پر یہ انقلاب کس حیرت انگیز تیزی سے آیا اور کس طرح دیکھتے ہی دیکھتے سارے جزیرہ نما پر حق کا نور سیلاب کی طرح پھیل گیا؛ اس کا حال ڈاکٹر محمد حمید اللہ سے سنیئے :۔

"۱ھ میں شہر مدینہ کے چند محلے اسلامی مملکت کہلانے لگے تو اس میں دس سال تک اوسطاً روزانہ ۲۷۴ مربع میل کی بے نظیر سرعت سے اضافہ ہوتا رہا اور جب ۱۱ھ میں نبی اکرم نے اس دنیاوی زندگی سے علیحدگی اختیار فرمائی تو پورے دس لاکھ مربع میل یعنی تقریباً ہندوستان کے برابر کا علاقہ مسلمانوں کی آقائی میں آچکا تھا۔ اور ابھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کو پندرہ سال بھی نہیں گزرے تھے کہ احکام اسلام پر عمل کرنے کے باعث مسلمان ایشیا، یورپ اور افریقہ کے تین براعظموں پر چھا گئے اور یہ حضرت عثمان کا زمانہ تھا کہ جب ایک طرف مسلمانوں

نے اسپین میں قدم جما لئے اور دوسری طرف قسطنطنیہ کا محاصرہ کر لیا۔[۱]"

عرب جیسی جاہل، بے مایہ اور صحرا نورد قوم یکایک دنیا کی توجہ کا مرکز بن گئی ــــ "وہ عرب مویشی چرانے والے لوگ جو ابتدائے آفرینش سے گمنامی کی حالت میں ریگستانوں میں مارے مارے پھرتے تھے، ان میں ایک ہیرو پیغمبر بھیجا گیا جو اپنے ساتھ ایک ایسا پیغام لایا جس پر وہ یقین کر سکتے تھے اور دیکھو! جنھیں کوئی توجہ نہ دیتا تھا، وہ عالمگیر توجہ کے حقدار ہو گئے جو حقیر اور کمتر تھے وہ دنیا کی نظروں میں معزز اور ممتاز بن گئے اور ایک ہی صدی کے اندر عرب اس طرف غرناطہ پر تھا تو اس طرف دہلی (د) میں اور ایک طویل عرصہ تک عربستان دنیا کے طویل حصہ پر چمکتا رہا۔[۲]"

اس بے مثال اور محیر العقول عروج کا سرچشمہ آنحضرت صلعم کی دلکش اور دلنواز شخصیت تھی۔ آپ کی حیرت انگیز شخصی کشش اور آپ کے اصولوں کی ہمہ گیر صداقت نے ہر گوشہ اور ہر طبقہ کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا اور چاروں طرف عقیدت کے بے مثال جذبات پیدا کر دیے تھے۔ یہ آپ کے اعلیٰ شخصی صفات، عزم کی صلابت اور پر خلوص شفقت کا اثر تھا کہ آپ کی قوم آپ کے ابرو کی جنبش پر نثار ہونے کو ہر وقت تیار رہی ہے۔

آپ کی آواز پر آپ کی امت کا ضمیر وجد کرتا تھا۔ آپ کے ارشادات کسی مطلق العنان صاحب کشور و نگین کے احکام نہ تھے۔ جاہ و جلال اور طاقت و ثروت کے مظاہر عوام کے قلوب میں اکثر انقیاد و مرعوبیت پیدا کر دیتے ہیں لیکن آپ کو نام اور نمائش سے فطری نفرت تھی۔ آپ نے کبھی اپنے پاس شان و شوکت کے لوازم جمع نہ ہونے دیے۔ تواضع و انکساری اور عاجزی و خاکساری آپ کی پسندیدہ اخلاقی صفات

---

[۱] آنحضرت صلعم اور جوانی   [۲] دی ہیرو ایز آ پرافٹ

تھیں۔ آپ اپنی بندگی اور بے مائیگی کا ہر نفس اقرار و اعلان فرماتے رہتے تھے۔ انبیاء کی عبدیت آپ کے لائے ہوئے دین کا بنیادی عقیدہ تھی۔ آپ بے تکلف فرمادیا کرتے تھے کہ میں تو ایک آدمی ہوں۔ جب دین کا کوئی حکم دوں تو اسے قبول کرو اور جب امور دنیا میں کوئی مشورہ دوں تو میں محض ایک آدمی ہوں۔ میں خدا پر جھوٹ نہ کہونگا[1]" اور یہ بھی کہ میری شان میں مبالغہ نہ کرو جیسا کہ یہود اور نصاریٰ نے اپنے پیغمبروں کی شان میں کیا ہے[2]"۔ اس سب کے باوجود آپ کی قوم کی وفا شعاری اور جاں نثاری کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے شاہی درباروں کے نمائندے دیکھتے تھے اور حیرت کرتے تھے۔

آج آپ کے عہد کو تیرہ سو برس گذر چکے ہیں۔ آپ کے غلاموں کی تعداد اب تیس کروڑ سے اوپر ہے۔ وہ دنیا کے تمام گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ عام روحانی اور اخلاقی انحطاط کا ان پر بھی اثر پڑا ہے اور وہ دین قیم کی صاف، سیدھی اور روشن راہ سے بھٹک گئے ہیں۔ لیکن اب بھی وہ اپنے آقا اور رسول کے نام و ناموس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کو حقیر سمجھتے ہیں اور جب آپ کا نام سنتے ہیں تو ادب سے آنکھیں نیچی کر لیتے ہیں اور درود اور سلام بھیجنے لگتے ہیں۔

جیسا کہ اب سے تیس برس پہلے ایک برطانوی اخبار میں شائع ہوا تھا" اگر کسی مرد عظیم کے بلند پایہ پیغام کے جانچنے کا پیمانہ تقدیس و تعظیم کے وہ جذبات ہیں جو اس کے الفاظ ان لوگوں میں پیدا کرتے ہیں جو اُن کی آسمانی نوعیت پر یقین رکھتے ہیں تو محمدؐ کا شمار عظیم ترین ہستیوں میں یقیناً ہونا چاہیئے[3]"۔

---

[1] مسلم

[2] بخاری کتاب الانبیاء

[3] ڈیلی ایکسپریس لندن مورخہ ۱۰ نومبر ۱۹۲۵ء (DAILY EXPRESS, LONDON NOV., 10, 1925.)

(۲)

نبی اکرمؐ کی ذات ہمیں ایک معیاری شخصیت کی حامل نظر آتی ہے جو دس برس کے مختصر عرصہ میں ایک نئے مذہب، ایک نئے تمدن، ایک نئے فلسفۂ حیات اور ایک نئی شریعت کی بنیاد رکھ کر ایک نئی قوم پیدا کرتی ہے اور سلف پرستی، توہم، ضد اور مخالفت کے باوجود گویا کہ اس (قوم) کی خواہش اور ارادہ کے بالکل خلاف اسکو روحانی و مادی ترقی اور سرفرازی کی شاہ راہ پر گامزن کر دیتی ہے۔

دس برس کے اندر تمام ملکِ عرب میں امن و امان قائم ہو گیا تھا، قبائل کی خانہ جنگیاں ختم ہو گئی تھیں۔ جرائم کا بازار سرد پڑ گیا تھا، رہزن رام ہو گئے تھے۔ خدا کا یقین عوام کی زندگی کا نشانِ راہ بن گیا تھا۔ خلوت و جلوت کے تمام معاملات میں وہ اس کی حاضر و ناظر ذات کو محسوس کرتے تھے۔ ایک ایسا معاشرہ وجود میں آگیا تھا جس میں امن قائم رکھنے کے لئے پولیس کی حاجت نہ رہی تھی۔ جرم مفقود ہو گئے تھے اور اگر کسی سے کوئی جرم سرزد ہو بھی جاتا تھا تو وہ خود بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر اقرار کر لیتا تھا۔

آنحضرت صلعم نے ایک بار بشارت دی تھی کہ عنقریب وہ زمانہ آئیگا کہ صنعاد (یمن) سے حجاز تک ایک محل نشین خاتون تنہا سفر کرے گی اور اسے علاوہ خدا کے کسی کا خوف نہ ہوگا۔ لوگ اس پر تعجب کرتے تھے کہ جس ملک میں بڑے بڑے قافلے سلامتی کے ساتھ نہیں گزر پاتے تھے وہاں پردہ نشین عورت ذات، مسافروں کو اتنا اطمینان بھلا کیسے نصیب ہوگا۔ لیکن چند ہی سال عدی بن حاتم نے شہادت دی کہ انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ آنحضرت صلعم کی پیشین گوئی کے مطابق ایک عورت صنعاد

سے حجاز تک تن تنہا سفر کرتی تھی اور راستہ میں اسکو کسی طرح کا خطرہ نہیں ہوتا تھا۔[1]

خارجی خطروں کا انسداد بھی آپ ہی کے سامنے ہو گیا تھا۔ عرب کے سرحدی علاقے رومیوں اور ایرانیوں کے پنجۂ ظلم سے آزاد ہو گئے تھے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد مسلمانوں نے ان کی طاقت پامال کر کے رکھدی

فتنہ و فساد کی جگہ صلح و امن کے قائم ہوتے ہی لوگوں کی روحانی اور اخلاقی صلاحیتوں نے ابھرنا شروع کیا اور ان میں زندگی کی نرم اور حسین قدروں کا شعور پیدا ہوا۔ عورتوں کو بے حرمت کرنے والے حقوق نسواں کے سب سے بڑے حامی بن گئے۔ جہاں بے قید کثرتِ ازدواج نے ایک وبا کی شکل اختیار کر لی تھی، وہاں نکاحوں کی تعداد متعین ہو گئی۔ جہاں گھر گھر شراب خانے کھلے رہتے تھے وہاں شراب ایسی حرام ہوئی کہ گلیوں میں مے نوشی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے ڈھیر لگ گئے، رنگ و نسل کی تفریق ایسی مٹی کہ آقا و غلام میں فرق کرنا مشکل ہو گیا۔ جھوٹ، غیبت، بہتان، رشوت، سود، قمار، ظلم، اولاد کشی اور حق تلفی وغیرہ کے بجائے ان کے برعکس اوصاف نے رواج پایا، جہاں ہر خاندان ایک علیحدہ دیوتا کے آگے سر جھکاتا تھا، وہاں معبودِ حقیقی کے علاوہ باقی تمام خدا اور خداوند جھوٹے ہو گئے اور جو لوگ اسی دنیائے آب و گل کی لذتوں کو زندگی کا ماحصل سمجھتے تھے ان میں آنے والی زندگی کا ایسا احساس پیدا ہوا گیا کہ اس میں کام نہ آنے والے تمام اعمال و عادات خود بخود موسم خزاں کے پتوں کی طرح جھڑ گئے۔

سید امیر علی کہتے ہیں کہ " ان چند برسوں نے واقعی کیسا انقلاب دیکھا تھا۔ یقیناً

---

[1] صحیح بخاری

جنت کا کوئی فرشتہ ملک سے ہو کر گزر گیا تھا جس نے ان لوگوں کے قلوب میں محبت و لطافت کا جادو پھونک دیا تھا۔ جو اس وقت تک نیم درندگی کی انتہائی قابل نفرت پستیوں میں دھنسے ہوئے تھے۔ لاقانونیت کا وہ جنگل جہاں تمام خدائی اور انسانی قوانین بلا جھجک جھٹلائے اور توڑے جاتے تھے، گلزار بن گیا تھا[1]۔"

سید امیر علی کے اس بیان کی بابت ممکن ہے کہ بعض غیر مسلم حلقوں میں سوچا جائے کہ ان کا قلم جوش عقیدت کی رَو میں تاریخی دیانتداری کی حد سے گذر گیا تھا، مگر سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) کی "لائف آف محمد" (LIFE OF MOHAMMAD) کے متعلق تو ایسا نہیں خیال کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ:۔

"محمد کے اصول مختصر اور سیدھے سادھے تھے۔ ان کی تعلیم نے غیر معمولی کامیابی حاصل کی۔ اس زمانہ سے لے کر جب ابتدائی مسیحیت نے دنیا کو خواب گراں سے چونکایا تھا اور کفر کے خلاف جان توڑ جدوجہد کا بیڑا اٹھایا تھا، لوگوں نے اس طرح کی روحانی بیداری کا منظر نہیں دیکھا تھا اور نہ اس طرح کی ایمانی قوت دیکھی تھی جو ضمیر کی خاطر تمام قربانیاں اور مال و اسباب کا نقصان ہنسی خوشی برداشت کراتی تھی۔"

.... ہجرت سے تیرہ سال قبل مکہ اس ذلیل حالت میں بے جان پڑا ہوا تھا۔ ان تیرہ برسوں نے اب کیسی تبدیلی پیدا کردی تھی۔ سیکڑوں آدمیوں کے گروہ نے بت پرستی ترک کر دی تھی۔ ایک خدا کی عبادت اختیار کرلی تھی اور خود کو مکمل طور پر اس ہدایت کے سپرد کر دیا تھا جس کی بابت ان کو یقین تھا کہ خدا کی طرف سے تھی۔

---

[1] "اسپرٹ آف اسلام" (SPIRIT OF ISLAM)

وہ اسی قادرِ مطلق سے رحم وعفو کے طالب ہوتے تھے اور صدقہ و خیرات، عصمت و عفت اور عدل و انصاف جیسے اچھے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ اب خدا کی بے پناہ قوت کو ہر وقت محسوس کرتے ہوئے زندگی گذارتے تھے اور چھوٹے چھوٹے معاملوں میں بھی اسی کی کارسازی پر نظر رکھتے تھے۔ قدرت کے تمام عطیوں میں، زندگی کے تمام مرحلوں اور زمانہ کے انقلابوں میں، خواہ وہ نجی ہوں یا اجتماعی، ان کو اسی کا ہاتھ نظر آتا تھا، مزید برآں اسی نئی زندگی کو عنایتِ ربّانی کی ایک خاص علامت سمجھا جاتا تھا اور انکار کرنے والوں کی بدعقیدگی کو بڑھتے ہوئے عذاب کا نتیجہ۔ ان کے نزدیک محمدؐ زندگی کے معلّم تھے، بہ فضلِ ایزدی ان کی نئی اُمنگوں کے مخزن تھے اور وہ ان کی مکمل اطاعت کرتے تھے.... حضرت موسیٰ کی صدائے حق مدینہ والوں کے کانوں میں عرصہ ہوا پڑ چکی تھی، لیکن رسولِ عربی کے روح کو بیدار کرنے والے نغمہ کو سننے کے بعد ہی وہ اپنی گہری نیند سے چونکے اور ایک نئی اور پرخلوص زندگی میں یکایک منہمک ہوگئے۔"

آنحضرت صلعم کا پیغام آپ کے قوم کے مزاج کی طرح صاف اور سادہ تھا۔ لیکن وہ یورپین مورخ سرتاپا غلطی پر ہیں جو آپ کی کامیابی کا سبب آپ کے احکام کا مکروہات اور ممنوعات کے بارے میں ڈھیلا ڈھالا ہونا بتلاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اسلام گوشت اور خون کے مطالبات کی بیدردانہ پامالی نہیں کرتا ہے اور نہ کوئی مذہب جو فطرت کے مطابق ہونے کا دعویٰ کرے ایسا کر ہی سکتا ہے، لیکن یہاں اسی کے ساتھ نفس کا اتنا مستحکم محاصرہ بھی ہے کہ کسی معاملے میں من مانی کرنے کی مطلق گنجائش نہیں

ہے۔شرع محمدی میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایسی واضح حد بندیاں ہیں جو مومن کی زندگی کو نظم و نسق کی تصویر بنا دیتی ہیں۔ جو دین دن میں پانچ وقت کی نماز اور سال میں تیس دن کے مسلسل روزے فرض کرتا ہو، جو لباس اور جسم کی طہارت پر سخت پابندیاں لگاتا ہو، جو زندگی کی ہر سانس کو ایک ہی خدا کی اطاعت میں گذارنے کا حکم دیتا ہو اس کے متعلق یہ کہنا کہاں تک درست ہے کہ اس کی جاذبیت کا راز نفس پروری کے مواقع مہیا کرنے میں ہے۔

یہاں کارلائل (CARLYLE) کا یہ قول نقل کرنا بے محل نہ ہوگا کہ "(محمد کا) مذہب آسان نہیں ہے۔ اس میں سخت قسم کے روزے ہیں۔ غسل و وضو کی قیدیں طرح طرح کے مشکل مسائل ہیں۔ دن کی پانچ وقت کی نماز ہے اور شراب کی حرمت ہے۔ اس کی کامیابی کا سبب اس کا آسان ہونا نہیں ہے۔"

پیغمبر صلعم کی شخصیت کی جامعیت آپ کے ارادہ کی پختگی، آپ کی دعوت کی تاثیر، آپ کے پیغام کی صداقت، آپ کی نیت کے اخلاص، آپ کے اخلاق کی پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و عنایت سے افق عرب سے رفتہ رفتہ تمام تاریکیاں دفع ہو گئیں اور ایک نئی صبح کا پرچم لہرانے لگا، ایک متحدہ قومیت، ایک متحدہ حکومت، ایک متحدہ تمدن، ایک منضبط قانون، ایک مکمل شریعت اور ایک ابدی مذہب کا درخشندہ دور وجود میں آگیا۔

(۳)

یہ مبارک دور عرب تک محدود نہیں رہا جو ساری دنیا کو خوشخبری سنانے ڈرانے، ہشیار کرنے اور پاک و صاف بنانے آیا تھا، جس کی حیثیت انسانیت کے

آخری معلم اور "نبوت کی عمارت کی آخری اینٹ" کی تھی۔ اس کا پیغام کسی جغرافیائی یا نسلی خطہ کے لئے مخصوص نہیں تھا۔ اسلام جلد ہی دنیا کے بہت بڑے حصّہ پر چھا گیا۔

اسلام کی روحانی اور علمی برکتوں کا رفتہ رفتہ یورپ پر اثر پڑنا شروع ہوا جو اس وقت تک نیم شائستگی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ اسلامی اسپین کے علمی اور تہذیبی مراکز ہی درحقیقت روشنی کے وہ منارے تھے جن کی بدولت قرون وسطیٰ کے اندھیرے سے نکلنا نصیب ہوا۔ پھر صلیبی جنگوں نے مختلف یوروپین قوموں کو اسلامی تمدن سے براہِ راست روشناس ہونے کا بیش قیمت موقع بہم پہنچایا۔ اس طرح یورپ کی نشاۃ ثانیہ عمل میں آئی اور۔۔۔ تاریخ کے جدید دور کا آغاز ہوا

مسلمانوں نے یورپ اور کل دنیا کو کیا کچھ دیا اسکو بیان کرنے کے لئے دفتر چاہئیں

بریفالٹ (BRIFFAULT) کا فیصلہ ہے کہ "اگرچہ یوروپین نشوونما کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر اسلامی تمدن کا فیصلہ کن اثر نہ پڑا ہو لیکن یہ اثر سب سے زیادہ نمایاں اس صلاحیت کو بیدار کرنے میں پایا جاتا ہے جو جدید دنیا کی سب سے زیادہ نمایاں اور امتیازی شان ہے۔ یعنی طبیعاتی سائنس اور سائنٹفک اسپرٹ"[۱]

دوسرے الفاظ میں قدیم سے جدید کی طرف تاریخ کا دھارا اسلام ہی نے موڑا۔

موجودہ زمانہ کے جید مورخ پروفیسر ٹوائن بی (PROF. TOYNBEE) نے اسلام کے تمدنی اثرات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ نسلی تفریق اور اونچ نیچ کا انسداد اور شراب کی حرمت یہ دو ایسے کارنامے ہیں کہ انھیں عالمگیر تہذیب میں اسلام کے مستقل اضافے کہا جا سکتا ہے[۲]

---

[۱] میکنگ آف ہیومینیٹی (MAKING OF HUMANITY)

[۲] سویلائزیشن آن ٹرائل (CIVILISATION ON TRIAL)

ہمارے اس نام نہاد جمہوریت اور برابری کے دور میں بھی اخوت اور مساوات کی بات درحقیقت فریب آرزو سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ نعرہ بازی اور مصلحت آمیز جھوٹ سے الگ ہو کر اگر دیکھا جائے تو یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یا تو برادری کے اعلانچی ان اعلیٰ اصولوں کے صحیح مفہوم ہی سے بے خبر ہیں یا وہ جان بوجھ کر دُنیا کو یا کم از کم پسماندہ دنیا کو دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ امریکہ میں حبشی النسل باشندے دوسرے درجہ کے شہری تصور کئے جاتے ہیں۔ برِاعظم افریقہ میں کالے گورے کی جنگ جاری ہے۔ ہندوستان کی کئی کروڑ آبادی اچھوت بنی ہوئی ہے معاشرتی اور اقتصادی حالات پر اعلیٰ و ادنیٰ کی تمیز ایک علیحدہ مصیبت ہے۔

دعوت اسلام کی بنیاد توحید پر ہے اور اس کا لازمی نتیجہ نوع انسانی کی وحدت کا اعتراف ہے۔ جب تمام انسان ایک ہی ذات پاک کے خلق کئے ہوئے ہیں تو پھر رنگ و نسل کے امتیازات اس سے زیادہ اور کیا حیثیت رکھ سکتے ہیں کہ یہ صرف تعارف کا ذریعہ ہیں، باقی عزت و شرافت میں ان کو کوئی دخل نہیں، چنانچہ فرمایا گیا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثَىٰ، وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (القرآن)	لوگو! میں نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لئے جاؤ۔ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔ خدا دانا اور واقف کار ہے۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر حسب نسب کی تلاش ایک عام بات ہے۔ نبی اکرمؐ اس انسانی کمزوری کے خطرناک امکانات سے خوب واقف تھے۔ آپ نے اپنی پھوپھی زاد بہن حضرت زینب کی شادی مکہ کے زرخرید غلام زید بن حارث سے کر کے مساوات کا عملی نمونہ پیش کیا۔ اسی طرح آپ نے حضرت ابو حذیفہ کی بھتیجی اور قریش کی ممتاز خاتون فاطمہ بن ولید کا عقد ابو حذیفہ کے غلام اُسامہ سے کرایا تاکہ آقا و غلام کے درمیان شرعی برابری کا سبق اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔

مدینہ کے انصار اپنی بیٹی دینے میں بہت سخت تھے، یہاں تک کہ جب قریش کے ممتاز رئیس ہاشم بن عبد مناف نے مدینہ کی ایک خاتون سے نکاح کی درخواست کی تھی تو اسکے قبیلہ نے اس شرط پر اجازت دی تھی کہ وہ کبھی رخصت ہو کر مکہ نہ جائیگی۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسی قبیلہ کی کایا ایسی پلٹی کہ ایک روز حضرت بلال نے مسجد میں اپنے بھائی کے لئے درخواست کی کہ میں غلام ہوں، حبشی ہوں، بے مایہ ہوں، بہ این ہمہ بھائی کی شادی کا خواہاں ہوں تو اس کے کئی معزز خاندانوں نے ان سے رشتہ قائم کرنے کی خود پیش کش کی۔

غرض کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قول اور نصیحت کے ساتھ اپنے عمل سے بھی عدم مساوات کے جملہ احتمالات کا خاتمہ کر کے اپنی ہی زندگی میں ایک ایسی سوسائٹی پیدا کر دی تھی جس میں اخوت اور برادری کی حیثیت صرف دل خوش کن نظریہ کی نہیں بلکہ عملی حقیقت کی ہو گئی تھی۔ آپ سے قبل نوع انسانی کو مساوات کا پیغام تو اکثر دینی رہنما سُنا چکے تھے، مگر ان کے ذہنوں میں انسانی وحدت کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ یہ کمی اسلام نے پوری کی " تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنے ہیں۔ یہ واضح اعلان

پیغمبر اسلام ہی کی زبان سے ہوا۔

فلنٹ (FLINT) کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ "کسی مسیحی مصنف یا اس سے بھی کم رومی سلطنت کے کسی شخص کو انسانی وحدت کے عام اور مبہم تصور سے زیادہ کا حقدار نہیں ٹھہرایا جا سکتا ہے۔"

یہ اسی تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا کہ حضرت عمر فاروق کا سفر شام والا واقعہ آج تک مثال کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ خلیفۂ ثانی عازم شام ہوئے تو ایک اونٹ تھا اور دو سفر کرنے والے۔ ایک آپ خود، ایک آپ کا غلام، چونکہ اونٹ کی پچھلی نشست پر زادِ راہ اور اونٹ کے لئے کھجور کی گٹھلیاں لدی ہوئی تھیں، اس لئے یہ طے پایا کہ نوبت بہ نوبت ایک سوار ہو اور دوسرا پیدل چلے۔ آخری منزل پر غلام کے سوار ہونے کی باری آئی تو اُتر پڑے۔ اُدھر دار السلطنت شام میں اسلامی افواج امیر المومنین کے استقبال کے لئے صف بستہ تھیں اور مختلف قوموں کے بہت سے لوگ اس جشن پر حشم کا تماشہ کرنے کو جمع ہو گئے تھے کہ گرد راہ سے ایک اونٹ نمودار ہوا۔ مسلمان امراء پیشوائی کے لئے بڑھے غیر مسلم تماشائیوں کو بڑی حیرت ہوئی۔ انھوں نے مسلمانوں سے پوچھا "کیا آپ کے خلیفہ یہی ہیں جو اونٹ پر سوار ہیں؟" اس پر ایک مجاہد نے جواب دیا "نہیں، ہمارے خلیفہ وہ ہیں جو پیدل چل رہے ہیں۔ اونٹ پر ان کا غلام سوار ہے۔"

عہد فاروقی ہی کا ذکر ہے کہ سلطنتِ غسان کا عیسائی شہزادہ جبلہ بن ایہم جس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں میں اس کی بڑی عزت ہوتی تھی ایک بار خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا کہ ایک بدو کا پاؤں اس کے چوغہ کے دامن میں پڑ گیا۔ شاہی مزاج اس کا متحمل نہ ہو سکا اور شہزادہ نے پلٹ کر بدو کے منھ پر طمانچہ مار دیا۔ بدو نے امیر المومنین

کی خدمت میں استغاثہ پیش کر دیا۔ انھوں نے شہزادہ کو طلب فرمایا، شہزادہ نے اپنے فعل کا اعتراف کیا مگر اس نے کہا کہ "میں ایک سلطنت کا حکمراں ہوں، اگر میں نے اس دہقانی کو مار دیا تو کیا ہوا؟" ارشاد ہوا "اسلام میں شاہ و گدا میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ تم اسے راضی کر لو ورنہ بدلہ دینا پڑے گا۔ اس نے ایک دن کی مہلت مانگی اور شبا شب مکہ سے فرار ہو کر مرتد ہو گیا۔ حضرت فاروق کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے فخر کے ساتھ سجدۂ شکر ادا کیا کہ دنیوی مصلحتیں انھیں شرعی احکام پر عمل کرانے سے نہیں روک سکتی تھیں۔

ایک دفعہ حضرت فاروق اور حضرت علی مرتضیٰ بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک یہودی نے آکر حضرت فاروق کی خدمت میں عرض کیا کہ "امیر المومنین! میں علی کے خلاف دعویٰ لے کر آیا ہوں۔" حضرت فاروق نے حضرت علی سے فرمایا "ابوالحسن سامنے کھڑے ہو کر جواب دو۔" حضرت علی فوراً اٹھ کھڑے ہوئے لیکن حضرت فاروق نے محسوس کیا کہ ان کے چہرہ پہ کچھ ناگواری کی جھلک آگئی تھی۔ دعویٰ سنا گیا، مدعی جھوٹا ثابت ہوا جب وہ فیصلہ سن کر چلا گیا تو حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا "میں ایک بات دریافت کرنا چاہتا ہوں۔" انھوں نے کہا ضرور پوچھئے۔" حضرت عمر نے کہا "کیا آپ کو عدالت میں یہودی کے برابر کھڑا ہونا ناگوار ہوا تھا؟" انھوں نے جواب دیا "ہرگز نہیں، میری ناگواری کا سبب یہ بات ہوئی تھی کہ آپ نے اسکے سامنے مجھے میرے نام کے بجائے ابوالحسن کی کنیت سے مخاطب کیا تھا۔ اگر اس یہودی کو گمان ہو جاتا کہ آپ انصاف کے معاملہ میں مجھے اس پہ ترجیح دیتے ہیں تو ہماری عدالت پر ہمیشہ کے لئے دھبہ آجاتا۔"

اسلامی تمدن کی تاریخ میں ایسے نظائر بے شمار ہیں اور اوراق کا دامن تنگ ہے، چنانچہ عہد مرتضوی کا ایک واقعہ بیان کر کے اس سلسلہ کو ختم کیا جاتا ہے۔ حضرت علی

ف: عرب میں تعظیم و عزت کے موقع پر بجائے نام کے کنیت سے خطاب کیا جاتا ہے۔

مرتضیٰ اپنے دورِ خلافت میں ایک روز ایک غلام کے ساتھ کپڑا خریدنے بازار تشریف
لے گئے اور بزاز کی دکان پر پہنچکر غلام سے فرمایا کہ میرے اور اپنے لئے کپڑے پسند کرلو۔
غلام نے کچھ قیمتی کپڑے پسند کئے اور کچھ سستے، قیمتی امیرالمومنین کے لئے اور سستے اپنے
لئے۔ درزی کے وہاں حضرت علی نے سستے کپڑے اپنے لئے قطع کرائے اور قیمتی غلام
کے لئے تو غلام نے عرض کیا کہ آپ میرے آقا اور امیرالمومنین ہیں، آپ کو نفیس لباس
پہننا چاہیئے۔" اس پر امیرالمومنین نے نرمی سے فرمایا "میں بڈھا ہوچکا ہوں، تم جوان
ہو، تم کو خوب صورت پوشاک زیادہ زیب دے گی۔"

پروفیسر ٹوائن بی (PROF. TOYNBEE) نے اسلام کا دوسرا تہذیبی شاہکار
تحریم خمر کو بتایا ہے۔

۱۹۱۰ء میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ایک اساسی ترمیم کے ذریعہ شراب
کی ممانعت کردی گئی تھی، بس اجازت یافتہ شراب خانوں کا بند ہونا تھا کہ ملک میں
لکھو کھا خفیہ شراب خانے کھل گئے جن میں ایک تو قیمت بہت زیادہ وصول کی جاتی
تھی، دوسرے شراب نہایت گھٹیا قسم کی ملتی تھی جو صحت کے لئے بہت مضر ہوتی تھی۔ رفتہ
رفتہ یہ دوکانیں حرام کاری کے اڈے بن گئے تھے جہاں شراب کے ساتھ نوجوان لڑکیوں
کی عصمت بھی پانی کی طرح لٹا کرتی تھی۔

قانونِ تحریم کے بعد مے فروشی کا پیشہ اتنا نفع بخش ہوگیا تھا کہ بے شمار آدمی اپنا روزگار
چھوڑ کر اس میں شامل ہوگئے تھے چلتے پھرتے میخانے الگ تھے۔ شراب کا کاروبار کرنے
والے ــــ ہوٹلوں، کارخانوں اور تفریح گاہوں میں چوری چھپے شراب پہنچاتے تھے اور
نئے گاہک پیدا کرتے تھے۔

شہروں کے علاوہ گاؤں گاؤں شراب کشید کرنے کے خفیہ کارخانے کھل گئے تھے، تحریم سے پہلے امریکہ میں کل چار سو اجازت یافتہ عرق کشی کے کارخانے تھے۔ تحریم کے بعد سات سال کے اندر ۷۹۴۳ کارخانے اور ۹۳۸۳۱ بھٹیاں پکڑی گئیں۔ قلیل ترین اندازہ یہ ہے کہ امریکہ میں شراب کا روزگار کرنے والوں میں دس گنا اضافہ ہو گیا تھا[۵]

شراب بندی کے سلسلہ میں قانون کی بے دھڑک خلاف ورزی کے نتیجہ میں عمومی طور پر قانون کا احترام بھی دلوں سے اٹھ گیا تھا۔ جرائم اتنا زور پکڑ گئے تھے کہ پر امن لوگوں کا رات میں نکلنا مشکل ہو گیا تھا۔ قتل کے جرائم میں ساڑھے تین سو فیصدی کا اضافہ ہو گیا تھا۔

بالآخر ۱۹۳۳ء میں حکومت نے ہار مان لی اور قانونِ تحریم واپس لے لیا گیا۔ چودہ برس بعد میخانے پھر جاگ اٹھے اور امریکن قوم نے اطمینان کا سانس لیا۔

امریکا ایک جمہوری طرز کا ملک ہے جہاں رائے عامہ کے ذریعہ حکومت ہوتی ہے۔ عوام کی رائے کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہی صورت قانون تحریم کی بھی تھی۔ یعنی ۱۹۲۰ء میں امریکن قوم کی اکثریت نے اپنی خوشی سے شراب کو اپنے اوپر حرام کر لیا تھا اور پھر ۱۹۳۳ء میں اسی اکثریت کو یہ اقرار کرنا پڑا تھا کہ شراب کی اخلاق سوزی مسلّم، اس کا امّ الخبائث ہونا برحق مگر ہم اسے چھوڑ نہیں سکتے۔

ان چودہ برسوں میں حکومت نے شراب کے خلاف پروپیگنڈہ پر کروڑوں روپیہ صرف کیا تھا اور لوگوں کو شراب سے باز رکھنے کی کوئی تدبیر اٹھا نہیں رکھی تھی لیکن بے سود۔

---

۵ سید ابوالاعلیٰ مودودی۔ تنقیحات، ص ۳۶

برخلاف اس کے اب سے چودہ سو برس پہلے جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت فرمائی تھی تو نہ وہاں تعلیم کی روشنی تھی نہ حکومت کے تنظیمی ادارے، نہ نشر و اشاعت کے موثر آلات اور لوگ لال پری کے ایسے متوالے تھے کہ ان کی زبان میں اسکے ڈھائی سو کے قریب نام اب بھی پائے جاتے ہیں۔

شراب کے متعلق سب سے پہلے یہ آیۂ کریمہ نازل ہوئی تھی :۔

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ	لوگ تم سے شراب اور جوئے کی بابت
قُلْ فِيْهِمَا اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ	پوچھتے ہیں۔ کہدو کہ ان دونوں میں
لِلنَّاسِ وَاِثْمُهُمَا اَكْبَرُ مِنْ	بڑی برائی ہے اور کچھ فائدے بھی
نَفْعِهِمَا (بقرہ)	ہیں لیکن ان کی برائی فائدہ سے زیادہ ہے۔

یہ کوئی حکم نہ تھا۔ لوگوں سے یہ نہیں کہا گیا تھا کہ شراب ترک کردو، صرف یہ بتایا گیا تھا کہ اس میں جوے کی طرح نفع کم اور نقصان زیادہ ہے۔ پھر بھی اس ارشاد ربانی کے بعد مسلمانوں کے ایک طبقہ نے شراب سے توبہ کرلی۔

بعض لوگ نشہ کی حالت میں نماز میں شریک ہو جاتے تھے اور طرح طرح کی غلطیاں کر بیٹھتے تھے۔ ان کی بابت شرعی حکم کی ضرورت ہوئی تو یہ آیت نازل ہوئی۔

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ	نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ
سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ	(تم کو نماز ایسی حالت میں ادا کرنا
(نساء)	چاہیئے) کہ تم جان سکو کہ کیا کہہ رہے ہو۔

اس کے بعد اگر شراب کے رسیئے نماز سے دور دور رہنے لگتے تو کوئی تعجب کی بات نہ ہوتی لیکن ایسا نہ ہوا۔ لوگوں نے بادہ نوشی کے اوقات مقرر کرلئے کہ نماز میں خلل نہ پڑے۔

دن میں نہ سہی رات ہی میں سہی قوم کا بہت بڑا حصہ اب بھی شراب پیتا رہا۔ صرف نماز ہی کے اوقات میں تو ہوش و حواس کی درستی ضروری تھی، باقی اوقات میں شغلِ مینا پر کوئی پابندی نہ تھی۔ لوگ رات میں آزادی سے پیتے تھے اور فتنہ و فساد برپا کرتے تھے لیکن مندرجہ بالا احکام نے تحریم خمر کے آخری اعلان کے لئے راستہ ہموار کر دیا تھا۔ چنانچہ کچھ مدت بعد یہ قطعی حکم نازل ہوا کہ :۔

یٰاَیُّھَاالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِنَّمَا	اے ایمان والو! بیشک شراب،
الخمرُ والمَیسِرُ وَالاَنصَاب	جوا، بت، پانسے، ناپاک اور
وَالازلامُ رِجسٌ مِّنْ عَمَل	شیطان کے کام ہیں تو ان سے
الشَّیطٰنِ فَاجْتَنِبُوْہُ لَعَلَّکُم	بچو تاکہ فلاح پاؤ۔
تُفلِحُوْن	(مائدہ)

جس وقت یہ آیت اتری حضرت ابو عبیدہ کے گھر پر کچھ احباب جمع تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر اطلاع دی کہ شراب حرام ہو گئی اور سوال و جواب کئے بغیر لوگوں نے جام و سبو ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے۔ تنہا ابو عبیدہ کے گھر کی کوئی تخصیص نہیں۔ جیسے جیسے خبر شہر میں گشت کرتی گئی لوگ اپنے اپنے گھروں سے شراب اٹھا اٹھا کر باہر پھینکتے گئے، یہاں تک کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سارے ملک عرب سے بادہ پرستی کا نام و نشان مٹ گیا۔ بعد میں اسلام جہاں جہاں پہنچا وہاں وہاں شراب کی ساخت و پرداخت اور خرید و فروخت کا قلع قمع ہو گیا۔

آج بھی جبکہ مسلمانوں میں دینی رجحان کمزور پڑ گیا ہے، شراب سے پرہیز کرنے

والوں کا جو اوسط ان میں پایا جاتا ہے دنیا کی کسی قوم میں نہیں پایا جاتا ہے۔ اور جو مسلمان اس گناہ کے مرتکب ہوتے بھی ہیں تو ان میں سے اکثر اسے بُرا سمجھتے ہیں اور چھپا کر پیتے ہیں۔

(۴)

پیغمبروں کا کام مصلحوں اور مقننوں کے کاموں سے بدرجہا بلند ہے۔ ان کا اصلی فرض دینی ہدایت اور رہبری ہے، یعنی لوگوں کو اوہام و خرافات سے نجات دلا کر رب العٰلمین سے ان کا رشتہ جوڑنا۔ جتنے بھی نبی آئے انھوں نے اسی اصول کو اپنی دعوت کا محور بنایا۔ ارشاد قرآنی ہے کہ :-

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ	اپنے سے پہلے رسولوں کے حالات معلوم
مِنْ رُّسُلِنَآ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ	کرو کہ کیا ہم نے کبھی اور کسی کو بھی ذات
الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ	پاک رحمٰن کے علاوہ معبود ٹھہرایا
(القرآن - زخرف)	جس کی لوگ عبادت کیا کریں۔

ان مقدس ہستیوں کو اللہ کی وحدت و وحدانیت تسلیم کرانے میں کس قدر کامیابی ہوئی اس کا اندازہ مختلف مذاہب کی عبادت گاہوں پر نظر ڈالنے سے بہ آسانی ہو سکتا ہے۔ مسلمانوں کی مسجدوں کے علاوہ کوئی عبادت گاہ ایسی نہیں ہے جہاں کسی نہ کسی شکل میں شرک موجود نہ ہو اور لطف یہ ہے کہ تمام معبدوں میں مسجدیں ہی سب سے زیادہ معمور ہیں۔ کہیں ہفتہ میں ایک بار جانا ضروری ہے۔ کہیں ہفتہ میں دو بار اور کہیں زیادہ سے زیادہ دن میں ایک بار، لیکن مسجدوں میں دن میں پانچ وقت کی حاضری ضروری ہے۔ اس کے علاوہ مساجد میں نہ زینت و آرائش کا کوئی سامان ہوتا ہے، نہ

سازو نغمہ کا اہتمام اور نہ تصور جمانے کے لئے کسی مادی شے کا اہتمام پھر بھی سب سے زیادہ عبادت گزار انہی میں ملتے ہیں۔

آنحضرت صلعم نے باطنی تصرف کے ساتھ عقلی براہین سے بھی کام لیا اور شرک کی شہ رگ پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ مسلمانوں کو ان اطراف سے خطرہ نہ رہا۔ آپ نے وحدانیت کی حقیقت پوری طرح بے نقاب کر دی، توحید فی الذات، توحید فی الصفات توحید فی العبادت، توحید فی الاستعانت، توحید فی العلم، توحید فی القدرت اور توحید فی التصرف کے الگ الگ عنوان قائم کئے اور ہر عنوان کے تحت میں مسائل پر ایسی بھرپور روشنی ڈالی کہ وقت کے الٹ پھیر ان میں ابہام پیدا کرنے سے معذور ہو گئے۔

یہی سبب ہے کہ دنیا کی تمام قوموں میں صرف مسلمان ہی خدا کی یکتائی اور بے مثالی پر مکمل عقیدہ رکھتے ہیں۔ باقی تمام مذہبی جماعتوں میں خدا کی ناقابل تعیّن ذات کو کسی نہ کسی طرح حدِّ تعیّن میں لانے کی کوشش نمایاں ہے۔ کہیں وحدت سے کثرت کی طرف مراجعت ہے، کہیں تثلیث کا چرچا ہے، کہیں ثنویاتی نقطۂ نظر کی حمایت ہے۔

تمام مذاہب کی بنیاد رکھنے والوں میں صرف آنحضرت صلعم ہی پوری طرح پر انسان نظر آتے ہیں۔ اس سے یہ مراد نہیں کہ دوسرے انبیاء انسانوں کے علاوہ کچھ اور بھی تھے لیکن ان کی حیثیتیں ان کی امتوں میں اتنی واضح نہ ہو سکیں کہ ان کے پیرو ان کو انسانوں کے علاوہ کچھ اور بھی سمجھنے کی غلطی سے بچ سکتے۔ آپ نے الوہیت اور نبوت میں ادنیٰ سی بھی مشابہت نہ پیدا ہونے دی، اسی لئے جب کہ اکثر مذاہب اپنے

بانیوں کے نام سے منسوب ہوئے آپ کا پھیلایا ہوا دین صرف اسی نام سے مشہور ہوا جو خدا نے اس کے لئے تجویز فرمایا تھا۔ یہ بھی آپ کی فرلضیۂ نبوّت کی کامیاب ادائیگی کی ایک روشن دلیل ہے۔

آٹھواں مقالہ

سرورِ کائناتؐ

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّۃً لِّلنَّاسِ

(اے محمد! ہم نے تمکو تمام ہی انسانوں کے لئے بھیجا ہے۔ القرآن سبا)

کائنات کی سروری کیا ہے؟ کائنات کو اس حکمتِ بالغہ کا عرفان عطا کرنا جو اس کے کارخانہ کو ازل سے چلا رہی ہے۔

اس عجیب و غریب کائنات، اس گوناگوں عالم کا ہیرو ابنِ آدم ہے جس میں خدا نے اپنی صفاتِ کاملہ کا عکس جلوہ گر کیا ہے۔ اِنَّ اللّٰہ خلق اٰدم علٰی صورتہٖ یہ اوصاف اخلاق انسانی کا معیار ہیں اور ابتدائے آفرینش سے دنیا کے تمام معلموں اور محسنوں نے ان ہی کا درس دیا ہے۔

دنیا کی درسگاہ میں انبیاء اور اولیاء سے لے کر مدبّروں اور خوش فکروں تک سبھی کے نام ملتے ہیں۔ انھوں نے نوعِ انسانی کی سطح بلند کرنے کی اپنے اپنے طرز پر کوششیں کیں۔ ہم پر ان سب کا احسان ہے لیکن سب سے زیادہ ممنون ہم ان نفوسِ

قدسیہ ہی کے ہیں جن کو انبیائے کرام کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

آج الحاد اور مادیت کے کارخانوں سے نکلے ہوئے سلیچے رسولوں کی عظمت اور ان کی تعلیم کی اہمیت کو مسخ کرنے کے درپے ہیں لیکن کوئی ان سے یہ پوچھے کہ حریت اور عدل، اخوت اور انسانی ہمدردی کی جو بھی جھلک ان کے عقائد و نظریات میں ملتی ہے وہ کس کی نور پاشی کا صدقہ ہے؟ غور و فکر، تجربہ و تجزیہ، جہد و ستیز، جو ان کے افق کے روشن ترین ستارے ہیں وہ انھوں نے پائے کہاں سے ہیں؟

وہمی و قیاسی مباحث سے قطع نظر عملی حیثیت سے بھی انسان کے سرمایہ میں پُر مسرت اور کامیاب زندگی کے جو بھی اثرات و نتائج پائے جاتے ہیں وہ انبیاء کے مقدس گروہ ہی کے فیوض و برکات ہیں۔ وقت کے شاہراہ پر جو نقش قدم وہ چھوڑ گئے ہیں، دنیا ان ہی پر چل کر اپنی منزل تلاش کر رہی ہے اور جب وہ راستہ سے بھٹک جاتی ہے تو یہی نقوش اس کی رہنمائی کر کے اُسے اندھیرے سے اُجالے کی طرف لاتے ہیں۔

علامہ سید سلیمان ندوی نے بالکل صحیح اور واقعہ کے عین مطابق فرمایا ہے کہ آج بھی جہاں عدل و میزان کا وجود ہے وہ کسی یونانی حکیم یا یورپین فلاسفر کی تعلیم و تصنیف اور خطبہ کا اثر نہیں ہے، بلکہ طبقۂ انبیاء ہی کی بے واسطہ یا بواسطہ تعلیمات کا نتیجہ ہے۔ آج دنیا کے گوشہ گوشہ میں کیسے ہی بدترین مبلغ سہی، مگر نیکی، احسان، عدل، ہمدردی، نکوکاری، حسنِ خلق کی تعلیم، تبلیغ اور دعوت ان ہی کی زبانوں سے ہو رہی ہے جو رسولوں کے پیرو اور پیغمبروں کے تابع ہیں ــــ جو عقیدہ کے ملحد ہیں ان کی بھی نکوکاری ان ہی پیغمبروں کے نادانستہ فیضانِ تعلیم کا نتیجہ ہے۔

اس بنا پر جو لوگ ذہنی طور پر پیغمبروں کے منکر ہیں وہ بھی عملی طور پر انکی تعلیم کے مقر اور معترف ہیں۔[۱]

مختصر یہ کہ اگر عالمگیر رہنما یا جگت گرو کی تلاش مقصود ہو اور انسان عارضی تاثرات اور اضطراری کیفیات سے بلند ہو کر تاریخ و تمدن کا بے تعصبی اور فراخدلی سے مطالعہ کر سکے اور ماضی کی روشنی میں مستقبل کی کسی حد تک رو کشائی ممکن ہو تو نظر انتخاب صنفِ انسانی کے ان ہی پاک طینت، بلند فطرت ہادیانِ حق پر پڑے گی جنھیں ہم نبی یا رسول کہتے ہیں۔

اب ذرا دنیا کی رہنمائی اور کائنات کی سروری کے متعلق اپنے ذہنوں کو صاف کرتے چلیں تو بہتر ہو گا۔ دنیا کا لیڈر وہی ہو سکتا ہے جس نے تمام ملکی اور نسلی اور طبقاتی قیدوں سے بلند ہو کر کل انسانی برادری کی بہبودی اور بھلائی اپنے سامنے رکھی ہو۔ ایک محبِ وطن یا قومی لیڈر اس اعتبار سے ضرور لائق احترام ہے کہ اس نے اپنے ملک و قوم کی بے لوث خدمت کی، ایثار کیا، تکلیفیں جھیلیں، عزم راسخ اور سیاسی فراست کے بہترین نمونے دکھلائے، غیروں کے جور اور اپنوں کے شر کا کامیاب مقابلہ کیا، ایک مضبوط حکومت قائم کی، معاشرتی اصلاحیں جاری کیں، وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کی غیر معمولی شخصیت کی کچھ کرنیں سیاسی اور جغرافیائی سرحدیں عبور کر کے بعض دوسرے علاقوں میں بھی نویدِ صبح لے کر پہنچی ہوں، مثلاً ابراہیم لنکن، لینن، اسٹالن، مصطفےٰ کمال، گاندھی، جناح وغیرہ سے ان کی قوموں سے نہ تعلق رکھنے والے بھی بعض طبقے عقیدت رکھتے ہیں۔ لیکن ان قومی محسنوں کو دوسری قومیں اپنا لیڈر نہیں مان سکتیں۔ روس اور چین میں آج کل کتنا نظریاتی اتحاد اور تعاون پایا جاتا ہے، مگر

---

[۱] سیرۃ النبی، جلد ۴۔ صفحہ ۲۰۶

کیا روسی ماؤزے تنگ کو اپنا قومی لیڈر تسلیم کرنے پر آمادہ کئے جا سکتے ہیں؟ بات صاف ہے۔ جس شخص کی محبت، خیر خواہی اور کارکردگی اسکے اپنے وطن تک محدود ہو، دوسرے ممالک اسے اپنا رہنما کیوں مانیں؟ ساری قوموں کا لیڈر تو وہی ہو سکتا ہے جس کے پاؤں میں نسل و جغرافیہ کی زنجیریں نہ ہوں۔ جس کی نظر میں سارے انسان ایک ہوں، جس کے دل میں سب کا یکساں درد ہو اور جو اپنے فکر و عمل کے پھل تقسیم کرتے وقت اپنے اور پرائے کا فرق روا نہ رکھتا ہو۔

دوسری اہم شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم زندگی کا کوئی ایک رخ نہیں بلکہ پوری تصویر پیش کرتی ہو۔ اس کا کردار انسانی فطرت کے جلوۂ صد رنگ کا مظہر ہو۔ اس کے اصول انسانی فطرت کے تمام پہلوؤں،.... اس کی طاقتوں اور کمزوریوں کا احاطہ کرتے ہوں اور ان کی حیثیت علمی یا فلسفیانہ نہیں بلکہ سراسر عملی ہو۔

پھر یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی رہنمائی کسی خاص زمانہ میں نہیں بلکہ ہر زمانہ اور ہر حال میں مفید، صحیح اور قابل عمل ہو۔ اس کا پیغام خزاں ناآشنا ہو۔ وقت اس کے اصول قلمزد نہ کر سکے۔ اس کا دریائے فیض ہمیشہ جاری رہے۔ اس کی تربیت گاہ کے دروازے کبھی بند نہ ہوں۔ جس کی قیادت ایک زمانہ میں نفع رساں اور دوسرے میں بیکار ہو، اسے دنیا کا قائد نہیں کہا جا سکتا۔ دنیا کی سروری تو اسی کا حصہ ہے کہ جب تک دنیا قائم رہے، اس کی سروری بھی کارآمد رہے۔

لیکن دنیا سرائے فانی ہے۔ مقدس سے مقدس ہستیاں، کامیاب سے کامیاب زندگیاں شاندار سے شاندار کارنامے بقاء دوام کی دولت سے محروم ہیں۔ آئندہ نسلوں کو جو بھی ہدایت اور رہبری مل سکتی ہے وہ صرف سیرت و تواریخ ہی کے ذریعہ۔ چنانچہ وہ نمونۂ حیات

جو انسانوں کے لئے ایک دائمی معیار کا کام دے سکے، اس کے لئے ضروری ہے کہ انسانوں کے سینوں اور سفینوں میں ہمیشہ محفوظ رہے۔ اسکے سارے خدوخال تاریخ کے اعتبار سے معتبر ہوں۔ اگر ان کی نوعیت قصوں اور کہانیوں کی ہوئی تو وہ مفید نہ ہوں گے۔ ہم اُن ہی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں جن کی صداقت اور واقعیت کی بابت ہمارے دلوں میں شبہ نہیں گزرتا، اسی لئے تاریخی واقعات میں جو طبیعتوں کو ابھارنے کی صلاحیت ہے وہ افسانوں اور حکایتوں میں نہیں پائی جاتی خواہ انھیں کتنے ہی موثر اور دلکش پیرایہ میں کیوں نہ بیان کیا جائے۔

ثانیاً اس معیاری رہنما کے صحیفۂ حیات کے تمام اجزاء ہمارے سامنے ہونا چاہئیں اس کی زندگی کے چھوٹے بڑے کل واقعات اور اسکی تعلیم کی مکمل تفصیل تاریخ میں محفوظ ہوگئی ہو تاکہ ہر زمانہ کے لوگ اس کی زندگی کا مطالعہ بالکل اس طرح کر سکیں جس طرح اس کے ساتھیوں اور پڑوسیوں نے اس کی زندگی میں کیا تھا۔

ایک اور شرط یہ ہے کہ اس مرد کامل نے صرف اصول پیش کر دینے پر اکتفا نہ کیا ہو بلکہ اپنی تعلیم اور ہدایت کو زندگی میں عملاً جاری کر کے بھی دکھایا ہو اور ان اصولوں کی بنیادوں پر ایک جیتی جاگتی سوسائٹی پیدا کر دی ہو۔

دنیا میں معصوم اقوال، پاکیزہ نصیحتوں اور بلند پایہ فلسفوں کی کمی نہیں، لیکن اس کے باوجود پرامن زندگی کی آرزو بس آرزو کی حد سے نہیں بڑھ پاتی۔ انسان نظریوں اور فلسفوں سے نہیں، عمل سے بنتا ہے۔ ویسے باتیں تو سبھی بنا لیتے ہیں۔

اگر کسی نظریہ یا فلسفہ کو کامیاب ہونا ہے تو اس کے پیچھے کسی عملی سیرت کا ہونا ضروری ہے، جو اس کی تعلیم اور اصولوں کو خود میں جذب کر کے دنیا کے لئے ایک چلتا پھرتا آئینہ بن جائے

اس سلسلہ میں علامہ سید سلیمان ندوی نے مشہور شاعر اور مفکر رابندر ناتھ ٹیگور کے ساتھ اپنی ایک گفتگو کا واقعہ نقل کیا ہے۔ علامہ ندوی اور شاعر ٹیگور ۱۹۲۴ء میں ایک ہی جہاز میں سفر کر رہے تھے۔ ایک نشست میں برہمو سماج کا ذکر نکل آیا۔ ٹیگور سے ان کے ایک ہمسفر نے اسکی ناکامی کا سبب دریافت کیا۔ وہ حاضرہ فلسفہ تمدن اور ماحول دیکھ کر بنایا گیا تھا۔ اس میں کوئی بات عقل و منطق کے خلاف نہ تھی، اس کے اصول منصفانہ اور صلح کل تھے اور اس کی تعلیم تھی کہ تمام مذاہب سچے اور ان کے بانی نیک اور اچھے لوگ تھے، تاہم وہ ترقی نہ کر سکا۔ ٹیگور نے جواب دیا کہ اس کے ترقی نہ کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ اس کے پیچھے کوئی شخصی زندگی اور کوئی عملی سیرت نہ تھی جو ہماری توجہ کا مرکز اور ہماری نکوکاری کا نمونہ بنتی۔[۵]

اور آخر میں یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مرد جلیل خود ایک زبردست شخصیت کا مالک ہی نہیں، بقول مولانا مودودی اپنی شخصیت کو پگھلا کر دوسروں کے قالب میں اتار دینے کی بھی صلاحیت رکھتا ہو۔ وہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی، کندن بھی اور کیمیا بھی۔ چراغ وہی سرچشمۂ نور کہا جائے گا جو اپنی لو سے چھوٹے بڑے سیکڑوں چراغ روشن کرے، اور جو ایسا نہ کر سکے وہ خود خواہ کتنی ہی روشنی کا حامل کیوں نہ ہو اس کی ضیا گستری بس اسکے دم تک رہیگی۔

(۲)

آئیے اب ان معیاروں پر نبوتِ محمدی کو جانچیں۔ اعتقادی اعتبار سے نہیں، تاریخی اعتبار سے۔ دوسرے انبیاء کی طرح حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب صرف ایک ملک یا ایک قوم کے باشندے نہ تھے، آپ کا خطاب تمام انسانوں اور پورے انسانی

---

۵ خطبات مدراس صفحہ ۱۹/۲۰

ضمیر سے تھا۔ ایک شخص اپنے آقا، رہبر اور ہادی یا پیغمبر کی تعریف میں دفتر کے دفتر لکھ سکتا ہے لیکن واقعات بہرحال واقعات ہیں۔ ان کی آواز دبائی تو جا سکتی ہے مگر مٹائی نہیں جا سکتی۔ حضرت موسیٰ نے حضرت یعقوب کی اولاد کو مصر کی غلامی سے بیشک آزاد کرایا ـــــ لیکن حضرت یعقوب کی اولاد ہی کو تو حضرت عیسیٰ نے "جنت میں ہمارا باپ" کی ضرور تبلیغ کی ـــ مگر "ہمارے" سے مراد بس بنی اسرائیل ہی تو تھے۔ مسیحی مبلغوں نے حضرت عیسیٰ کی بعثت کے دائرہ کو اب بے حساب وسعت دیدی ہے جس کا اپنی زندگی میں آپ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، ورنہ آپ یہ نہ کہتے کہ "میں اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا"۔ یا "مناسب نہیں کہ اسرائیل کے لڑکوں کی روٹی (ان کا مذہب) کتوں (غیر اسرائیلی قوموں) کو پھینک دوں" اور نہ یہ فرماتے کہ "اپنے موتی سوروں کے آگے مت پھینکو"[۵]

اسکے برخلاف آنحضرت صلعم کی بعثت ساری دنیا کا سرمایۂ سعادت ہے۔ قرآن مجید میں دعوتِ اسلام کی عالمگیری کا جا بجا اعلان کیا گیا ہے جو ہم کو کسی دوسرے مذہب کی بابت اسکے صحیفوں میں نہیں ملتا"۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۨالَّذِىْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (اعراف)	اے محمد! ان سے کہدو کہ اے فرزندان آدم! میں تم سب کے لئے اللہ کا رسول ہوں اس اللہ کا رسول جو زمین و آسمان کا مالک ہے۔
وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ هٰذَا بَلٰغٌ لِّلنَّاسِ (ابراہیم)	اے محمد! ہم نے تم کو تمام دنیا کیلئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ یہ قرآن تمام انسانوں کیلئے پیغام ہے

---

[۵] انجیل متی

چنانچہ جتنا گہرا اور عالمگیر اثر آپ نے نوعِ انسانی کی تاریخ و تقدیر پر ڈالا آج تک کسی دوسرے انسان کے حصہ میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں آیا۔ آپ کے چشمۂ فیض سے کوئی قوم بھی محروم نہیں رہی۔ نہ عربی، نہ عجمی، نہ زنگی، نہ فرنگی، نہ حبشی، نہ ہندی ــــ اور یہ کسی پرجوش عقیدتمند کی مدح خوانی نہیں، ایک کھلی ہوئی تاریخی حقیقت ہے جس کا اعتراف تمام ہی انصاف پسند۔ اور بسا اوقات غیر انصاف پسند مبصّروں نے بھی کیا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر جے، ڈبلو، ڈریپر (J.W. DRAPER) لکھتے ہیں کہ "تمام انسانوں میں نسل انسانی پر سب سے زیادہ اثر محمد نے ڈالا ہے[1]" یا دنیا کے جید مورخ ایڈورڈ گبن کا اسلام کی بابت یہ قول "ایک ناقابل فراموش انقلاب جس نے کرۂ ارض کی تمام قوموں پر ایک نئے اور دائمی طرز کی اثراندازی کی ہے[2]"

یہ آپ کے پیغام کی عالمگیری ہی تو تھی جس نے تمام نسلی اور قومی امتیازات پاؤں تلے روند کر رکھ دیئے۔ رسول اللہ صلعم نے عالمگیر انسانی برادری اور مساوات کا جو عملی تصور پیش کیا وہ اتنا عالم آشکارا ہے کہ یہاں اس کی تشریح کی ضرورت نہیں ہے۔ پروفیسر ٹوائن بی (TOYNBEE) نے رنگ و خون کی تفریقوں کے انسداد کو عالمی تہذیب پر اسلام کا ایک گراں قدر احسان قرار دیا ہے۔ پچھلے مقالہ میں ہم اس پر بحث کر چکے ہیں۔

اسلام سے پہلے مسیحیت اور بدھ مت بھی مساوات کا تخیل پیش کر چکے تھے۔ مگر وہاں اسکی حیثیت محض ایک عالمانہ درس اور ایک فلسفیانہ تصور کی تھی۔ وہ

---

[1] HISTORY OF THE INTELLECTUAL DEVELOPMENT OF EUROPE

[2] ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن امپائر۔ جلد ۵

نسانی وحدت کا کوئی عملی نظام وجود میں نہ لا سکے تھے۔ اسلام میں اس کی صورت بالکل مختلف تھی۔ یہاں انسانی برابری اور اخوّت کوئی شاعرانہ تخیل یا فکری نظریہ نہیں بلکہ ایک زندہ حقیقت تھی

رسول اللہ صلعم نے اور مسائل کی طرح نسلی تعصّب کا بھی مقابلہ خالص عملی انداز میں کیا اور عدم مساوات کے جملہ احتمالات کو ختم کر دیا۔ وحدتِ اسلامی میں داخل ہونے والے ہر شخص کو آپ ہی کے دور میں یکساں قانونی، شرعی اور اخلاقی حقوق حاصل ہو گئے تھے۔ یہ طریقہ اسلامی عروج کی تمام صدیوں میں رائج رہا اور آج مسلمانوں کے تنزل وانحطاط کے عہد میں بھی برابری اور برادری کے جو مناظر ان کے اجتماعوں میں نظر آتے ہیں کسی دوسرے مذہب میں نہیں ملتے۔ خانہ کعبہ اور مسجد نبوی سے لیکر چھوٹے چھوٹے مسلم گھرانوں کی جانمازوں تک اور دسترخوانوں سے لیکر قبرستانوں تک عربی و عجمی، ہندی وحبشی، شاہ و گدا اور امیر و غریب کا کوئی فرق نہیں ملتا ہے۔

خود دربارِ نبوی مختلف نسلی وملکی پھولوں کا گلدستہ تھا۔ اس میں عداس نینوائی، صہیب رومی، ذوالکلاع حمیری، ابوسفیان اموی، کرز فہری، بلال حبشی ضماد ازدی، عدی طائی، ابوذر غفاری، ابوحارث مصطلقی، سلمان فارسی، طفیل دوسی، ثمامہ نجدی، ابوعامر اشعری، سراقہ مدلجی پہلو بہ پہلو بیٹھے نظر آتے تھے اور ہر شخص اپنے ملک اور اپنی قوم کی نمائندگی کرتا تھا۔

بقول ڈاکٹر رائیڈن (DR. MOUDE ROYDEN) پہلی حقیقی جمہوریت جس کا تصوّر ذہن انسانی میں پیدا ہوا اس کا اعلان محمدؐ کے مذہب ہی نے کیا۔"

دوسری شرط جامعیت کی ہے۔ زندگی خواہ انفرادی ہو یا اجتماعی اسکے جسمانی، جذباتی نفسیاتی، معاشرتی، اخلاقی، ذہنی، روحانی۔ غرضکہ بہت سے پہلو ہیں جو ایک دوسرے کے اندر اس طرح سمائے ہوئے ہیں کہ ان کو الگ الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کے حریف نہیں معین ہیں اور اپنے اپنے کام انجام دیکر ایک دوسرے کی بقا و ترقی میں مدد دیتے ہیں۔ ہم ان میں ایک کی خاطر دوسرے کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔ اس لئے ایک دائمی اور عالمی معلم کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس کا سایہ ان تمام پہلوؤں پر پڑے اور اصلاحات انسانی کا کوئی شعبہ ایسا نہ بچ رہے جس کی تکمیل اسکی تعلیم و عمل سے نہ کی گئی ہو۔ یہ جامعیت ہم کو پیغمبر اسلام کے علاوہ کسی اور پیغمبر کے یہاں نہیں ملتی۔ اس میں شک نہیں کہ خدا کے تمام پیغمبر معیاری شخصیتوں کے حامل تھے لیکن ایک تو آنحضرت صلعم کے سوا باقی کل پیغمبروں کی سیرت اور مستند واقعات زندگی کے بارہ میں خود ان کے مذاہب اور قومیں اتنی بے بضاعت اور تہی مایہ ہیں کہ ان کے مشاغل، تعلیم اور ماحول کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور دوسرے ان کو انسانی زندگی کے ان تمام گوشوں سے ہو کر گزرنا نہیں پڑا جن میں ان کی فطرت و کردار کی مختلف خوبیوں کو — جو یقیناً ان میں موجود ہوں گی — منظر عام پر آنے کا موقع ملتا۔

یہی وجہ ہے کہ تاریخی شخصیتوں پر جب اس پہلو سے نظر ڈالی جاتی ہے تو علاوہ پیغمبر اسلام کی جامع اوصاف ذات کے باقی سب کی زندگیوں میں ایک جا بجا ہی لیتا ہوا خلا نظر آتا ہے۔ کوئی نظریات کا بادشاہ ہے مگر عمل کی قوت نہیں رکھتا۔ کوئی عمل کا پتلا ہے مگر فکر میں کمزور ہے۔ کسی کے کمالات سیاست و تدبر تک محدود ہیں۔ کوئی محض فوجی ذہنیت کا مظہر ہے۔ کسی کی نظر اجتماعی زندگی کے چند پہلوؤں پر ایسی پڑی کہ باقی

پہلو اوجھل ہو گئے۔ کسی نے اجتماعیت کے آستانہ پر انفرادیت کو قربان کر دیا۔ کسی نے انفرادیت کو ایسا ابھارا کہ خاندان اور معاشرہ کے رشتوں کو توڑ مروڑ کر رکھ دیا۔ کسی نے روحانیت اور اخلاق کو نظر انداز کر دیا۔ احکام کی تفصیل، انضباط اور ہمہ گیری صرف اسلام کا حصہ ہے۔

آنحضرت صلعم کی ذاتِ اقدس میں انسانی زندگی کی تمام حیثیتیں جمع تھیں۔ "آپ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ، ایک شوہر، ایک دوست، ایک خانہ دار ایک کاروباری تاجر، ایک افسر، ایک حاکم، ایک سپہ سالار، ایک بادشاہ، ایک استاد ایک واعظ، ایک مرشد، ایک زاہد و عابد اور آخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔"[1]

آپ ابراہیم و موسیٰ بھی تھے اور یعقوب و ایوب بھی، داؤد و سلیمان بھی تھے اور یحییٰ و عیسیٰ بھی، باسورتھ اسمتھ (BOSWORTH SMITH) نے لکھا ہے کہ "آپ ایک سہ گانہ موسس تھے۔ آپ نے ایک مذہب، ایک تہذیب اور ایک سلطنت کی بنیاد ڈالی"[2]

جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جس طرح دوسرے بانیانِ مذہب جامعیتِ کبریٰ سے خالی تھے اسی طرح ان کی زندگی کے صحیفوں کی تصویریں بھی نامکمل لی گئیں۔ زیادہ تر کی زندگیاں تو قیاس و افسانہ کے دھندلکوں میں گم ہو گئی ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام کی سیرت تاریخی اعتبار سے اس درجہ معتبر ہے کہ ساری دنیا اس کی معترف ہے اور مسلمانوں کے اس دعویٰ کا کوئی بھی حریف نہیں ہو سکتا کہ انھوں نے اپنے نبی کے حالات ایک طرف وسعت اور تفصیل کے ساتھ قلمبند کئے کہ شکل و شباہت، وضع و قطع، رفتار و گفتار، اقوال و افعال، عادات و اطوار، طرز زندگی اور طریق معاشرت کی ایک ایک بات محفوظ ہو گئی اور دوسری طرف صحت کا ایسا انتظام کیا کہ کسی آسانی

---

[1] سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۷ [2] MOHAMMAD AND MOHAMMADANISM

کتاب کے لئے بھی نہ ہو سکا۔

پیدائش سے لیکر وفات تک آنحضرت صلعم کی کل زندگی آپ کے مشاغل اور ارشادات کی کمل تفصیل کے ساتھ سیرت و تواریخ کی انتہائی مستند کتابوں میں محفوظ ہے جن کے ذریعہ آپ کی ذات و صفات کا اس سے کہیں زیادہ علم حاصل کیا جا سکتا ہے جتنا کہ لوگ عموماً اپنے بزرگوں اور دوستوں کے متعلق جانتے ہیں۔ خواجہ کمال الدین نے یہ جو لکھا ہے کہ میں بہت سی حیثیتوں سے اپنے والدین سے زیادہ آپ سے واقف ہوں تو اس میں قطعی کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ نہ جانے کتنے مسلمان قسم کھا کر یہی عرض کر سکتے ہیں۔

عہد نبوی کی تصویر کو باقی اور نبوت کے کلام اور ماحول کو محفوظ رکھنے کے لئے محدثین نے کس طرح اپنی زندگیاں وقف کر دیں، کیا کیا مشقتیں جھیلیں اور کیسے کیسے دشوار سفر کئے اور راویوں اور روایتوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لئے انھوں نے کیسے سخت اصول مرتب کئے اس کی تفصیل کے لئے نہ تو ہمارے مقالہ میں گنجائش ہے اور نہ یہ اس کا موضوع ہے۔ یہاں اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ انھوں نے اس کی خاطر عربی ادب میں اسماء رجال اور فن روایت کے ایک نئے اور مستقل شعبہ کا اضافہ کر دیا اور چھوٹی سے چھوٹی بات کی تحقیق کے لئے کوئی انسانی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ یہی وجہ ہے کہ جان ڈیوبورٹ (JOHN DAVENPORT) کی کتاب APOLOGY FOR MOHAMMAD AND THE KORAN کے افتتاحی الفاظ یہ ہیں کہ "اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقننوں اور فاتحوں میں ایک بھی ایسا نہیں جس کے سوانح حیات محمدؐ کے سوانح حیات سے زیادہ کمل اور سچے ہوں۔"

اور آر، وی، سی باڈلے (R.V.C. BODLEY) کا یہ کہنا ہے کہ:۔

"ہمارے پاس موسیٰ، کنفیوشیس یا گوتم بدھ کا کوئی معاصرانہ ریکارڈ نہیں ہے

اور عیسیٰ کی زندگی کے بس ایک جزو کے چند اجزاء ہم جانتے ہیں۔ ان کی زندگی کے ان تیس برسوں کا جنھوں نے آخری تین برسوں کے لئے راستہ ہموار کیا ہم کو کچھ علم نہیں ہے مگر محمدؐ کی کہانی انتہائی روشن ہے۔

یہاں اسرار اور پر چھائیاں نہیں، تاریخ ہے، ہم محمدؐ سے ویسے ہی واقف ہیں جیسے کہ اپنے کسی قریب العہد شخص سے ان کا خارجی ریکارڈ — ان کی جوانی، ان کے اعزا، ان کے عادات و اطوار — نہ تو افسانہ ہے نہ سنی سنائی بات، اور نہ ان کی بعثت کے بعد کا ان کا داخلی ریکارڈ کسی مغلق یا مشوش واعظ کی دھندلی روایت ہمارے پاس انہی کے ہمعصروں کا قلمبند کیا ہوا ان کا ایسا ریکارڈ ہے جو اپنے آغاز اور تحفظ دونوں لحاظ سے قطعی یکتا ہے اور جس کی سچائی کے متعلق ایک بھی سنجیدہ شبہ ظاہر کرنا کسی کے لئے ممکن نہیں ہو سکا ہے۔"

یہی مصنف ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ :-

"عیسیٰؑ کے سوانح کا سب سے زیادہ مایوس کن پہلو ان کی ابتدائی عمر اور نوجوانی کے حالات کی تفصیل کا فقدان ہے۔ ہم ان کی پیدائش کی بابت سنتے ہیں، اور پھر وہ یکایک تیس برس کے ہو کر معجزے دکھانے لگتے ہیں۔ پھر تین برس بعد وہ مر جاتے ہیں۔ موسیٰؑ کی سیرت کی بھی یہی کمزوری ہے — ہم ان کی زندگیوں کے صرف ان حصّوں سے واقف ہیں جب وہ عروج پر پہنچ چکے تھے۔ اسکے قبل کے اوراق بالکل سادہ ہیں۔ اس بات نے اور اسی کے ساتھ ان کے شیشہ، لکڑی اور پتھر کے مجسموں نے ان کو تقریباً دیو مالا اور مابعد الطبیعات کے کردار بنا دیا ہے۔ محمدؐ اوروں کے مقابلہ میں دیرینہ تاریخ گری کا کام شروع کرتے ہیں، لیکن جو معلوم کرنا چاہیں ان کے لئے ان کے اس سے قبل کے

حالات بالکل چھپے یا ڈھکے نہیں ہیں[1]"

قرآن مجید کے ساتھ سیرت و حدیث کے ذخیروں کا اس طرح محفوظ رہنا اسلام کا اعجاز اور اس کا ایک امتیاز ہے جس میں کوئی مذہب اور کوئی امت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ایڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) لکھتے ہیں کہ "آپ کے مذہب کی جو چیز واقعی حیرت انگیز ہے وہ اسکی اشاعت نہیں بلکہ اس کا ثبات، اس کی پائیداری اور اس کی شان دوام ہے، جو صاف اور سادہ نقش آپ نے مکہ اور مدینہ میں کندہ کیا تھا، بارہ صدیوں کے انقلابات کے بعد آج بھی قرآن کے ہندی، افریقی اور ترکی نو معتقدوں کے پاس اسی طرح محفوظ ہے، اگر ایسا ہو سکے کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواری سینٹ پیٹر یا سینٹ پال (VATICAN) روم میں پوپ کی سرکاری قیام گاہ) لوٹ آئیں تو ان کو غالباً اس مورتی کا نام دریافت کرنے کی ضرورت پڑے جس کی پوجا اس عظیم الشان مندر میں ان عجیب و غریب رسموں کے ساتھ کی جاتی ہے[2]"

ہدایت اور تعلیم کا سب سے کارگر اسلوب یہ ہے کہ صرف زبان سے نہ کہا جائے بلکہ جن اصولوں کی تعلیم دینا ہو ان کو اپنی ہی زندگی میں جذب کر کے ایک عملی نمونہ، ایک قدم آدم درس بن کر بھی لوگوں کے سامنے آیا جائے کیونکہ انسان بہر حال کانوں کے ذریعہ کم اور آنکھوں کے ذریعے زیادہ سیکھتا ہے اور اسکے بننے یا بگڑنے کا انحصار ان باتوں پر کم ہوتا ہے جو وہ سنتا ہے اور ان باتوں پر زیادہ جو وہ دیکھتا ہے۔

اسلام کے پیغمبر کا یہی دستور تھا۔ کبھی کوئی نصیحت آپ کی زبان سے نہ سنی گئی جس پر پہلے خود آپ نے عمل کر کے نہ دکھایا ہو، لوگوں کو یاد الٰہی کی ترغیب دی تو خود دل

---

[1] دی میسنجر، ص ۲ و ص ۱۰۳ (THE MESSENGER, THE LIFE OF MOHAMMAD)
[2] جلد ۵، صفحہ ۳۹۴ OP. CIT. VOL V

بہ یار دوست بہ کار" کا مصداق بن گئے۔ نماز کی نصیحت فرمائی تو اپنا یہ عالم بنالیا کہ آج تک کسی نمازی کو اسکے قریب بھی پہنچنے کی توفیق نہ ہو سکی۔ ساری ساری راتیں نماز پر ہی گذر جاتی تھیں اور کھڑے کھڑے پاؤں ورم کر آتے تھے۔ روزوں کی فرضیت کا اعلان کیا تو اوروں کے لئے ماہ رمضان کے تیس یا انتیس روزے فرض بتائے اور اپنا یہ حال کر لیا کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ روزہ رکھنے پہ آتے تو معلوم ہوتا کہ اب کبھی افطار ہی نہ کرینگے۔ زکوٰۃ و خیرات کا حکم دیا تو خود ایسے کشادہ دست ہو گئے کہ جو پایا خدا کی راہ میں خرچ کر دیا۔ یہی شان زہد و قناعت، توکل و ایثار، صبر و شکر، رحم و کرم، حلم و بردباری، عفو و درگذر وغیرہ کے بابوں میں تھی۔

کائنات کی رہنمائی کا آخری معیار رہنما کی کیمیا اثری ہے، یعنی وہ غیر محسوس طاقت جو دیکھتے ہی دیکھتے انسانوں کی تقدیریں پلٹ دیتی ہے وہ صلاحیتِ اکسیر صفت جو دوسروں کی صلاحیتیں اس طرح ابھار دیتی ہے کہ وہ خود حیران رہ جاتے ہیں، وہ وہبی استعداد جو خود ہی انقلاب کا سامان تیار کرتی ہے خود ہی اس کی سمت کا تعین کرتی ہے اور پھر خود ہی زمانہ کو موڑ کر اس کی طرف لے جاتی ہے۔

گڈریوں اور چرواہوں کی ایک جاہل و ناشائستہ قوم جو جائز و ناجائز، صحیح و غلط کی تمیز سے تقریباً ناآشنا تھی، جو خانہ جنگیوں کے لامتناہی سلسلہ میں اس طرح جکڑی تھی کہ قومی فلاح و بہبود کا تصور اس کے ذہن سے بھی نہیں گزر پاتا تھا۔ ایک ایک برزخ کامل، ایک ہستی جامع کے اثر سے یکایک دینی و دنیوی ترقی کی بلند ترین صدر گاہوں کو زینت بخشنے لگتی ہے اور اسکے خشک ریگستانی خطے سے علم و حکمت، سعادت و قوت کے وہ سر چشمے پھوٹتے ہیں کہ اس وقت کی دریافت شدہ دنیا کے

تینوں براعظم ان سے سیراب ہونے لگتے ہیں۔

ان کے مسخ شدہ ذہنوں میں ایسا شاندار انقلاب آیا کہ بے جان معرفت سے نکل کر وہ ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدہ تک پہنچ گئے جو ان کے سارے انفرادی اور اجتماعی وجود پر حاوی تھا۔ اب وہ ہمہ وقت خدا کی بے پناہ قوت کو محسوس کرتے ہوئے زندگی بسر کرتے تھے۔ چھوٹے سے چھوٹے معاملات میں بھی اسی کی کارسازی پر نظر رکھتے تھے اور اپنی اس نئی زندگی کو عنایت ربانی کی ایک خاص علامت سمجھتے تھے۔ بقول سر ولیم میور (SIR WILLIAM MUIR) "ان کے نزدیک محمدؐ زندگی کے معلم تھے، بہ فضل ایزدی ان کی نئی امنگوں کے مخزن تھے اور وہ ان کی مکمل اطاعت کرتے تھے۔"[۱]

اگر کبھی صفت بہیمی زور کرتی اور ان سے غلطی سرزد ہو جاتی تو اگرچہ یہ ایسا موقع ہوتا کہ کوئی آنکھ دیکھنے والی نہ ہوتی اس گناہ کی یاد ان کو چین سے نہ بیٹھنے دیتی اور وہ خود جا کر قانون کے سامنے اقبال جرم کر لیتے اور سخت سے سخت سزا کے لئے اپنے کو پیش کر دیتے تاکہ خدا کی ناراضگی سے بچ سکیں اور آخرت میں سزا بھگتنے کے بجائے دنیا ہی میں بھگت لیں۔ معتبر اسلامی مورخین نے اس سلسلہ میں ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کئے ہیں جن کی مثال اسلام کی دینی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں مل سکتی۔ ہم یہاں صرف دو واقعات نقل کرینگے۔

ایک روز ماعز بن مالک اسلمی رسول اللہ صلعم کے پاس حاضر ہوئے اور کہنے لگے کہ "یا رسول اللہ مجھ سے خطا ہوئی ہے۔ میں زنا کا مرتکب ہو گیا ہوں اور میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے پاک کروا دیں۔" آپ نے ان کو واپس کر دیا۔ دوسرے دن وہ پھر آئے اور کہنے لگے "یا رسول اللہ میں زنا کا مجرم ہوں۔" آپ نے ان کو دوبارہ واپس کر دیا اور ان کے

---

[۱] لائف آف محمد (LIFE OF MOHAMMAD)

گھرانے سے دریافت کرایا کہ ان کی سمجھ میں کسی طرح کی خرابی تو نہیں یا کوئی عادت کے خلاف بات تو نہیں پائی جاتی۔ گھر والوں نے جواب دیا کہ ہم تو صرف اتنا جانتے ہیں کہ وہ سمجھدار اور اچھے خاصے آدمی ہیں۔" ماعز بن مالک پھر تیسری بار آئے۔ آپ نے دوبارہ ان کی دماغی حالت کے بارہ میں دریافت کرایا۔ جواب یکساں ملا۔ چوتھی بار جب وہ آئے تو آپ نے نصف دفن کروا کے سنگسار کر دینے کا حکم دیا۔[۱]

دوسرا واقعہ غامدیہ کا ہے۔ انھوں نے بھی ایک روز دربار نبوی میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھ سے زنا کی غلطی سرزد ہو گئی ہے طاہر کروا دیجئے۔" آپ نے ان کو واپس کروا دیا۔ دوسرے روز پھر آئیں اور کہنے لگیں "آپ مجھے کیوں واپس کرتے ہیں۔ شاید اسی طرح جس طرح ماعز کو واپس کر دیا کرتے تھے۔ میں حاملہ بھی ہوں۔" آپ نے فرمایا "تو پھر جاؤ جب ولادت ہو جائے تب آنا۔" ولادت سے جب فارغ ہوئیں تو پھر آئیں۔ بچہ کپڑے میں لپٹا ہوا تھا۔ کہنے لگیں "یہ میرا بچہ ہے۔" آپ نے فرمایا "جاؤ بچّہ کو دودھ پلاؤ۔ جب یہ کچھ کھانے لگے تب لے کر آنا۔" جب دودھ چھڑایا تو پھر آئیں۔ لڑکے کے ہاتھ میں روٹی کا ٹکڑا تھا، بولیں "اے اللہ کے نبی لیجئے میں دودھ پلانے سے فارغ ہو گئی اور یہ روٹی کھانے لگا۔" آپ نے لڑکا ایک مسلمان کے سپرد کیا اور حد قائم کرنے کا حکم دیا۔ ان کے سینہ تک گڑھا کھودا گیا اور آپ نے حکم فرمایا، لوگوں نے سنگسار کر دیا۔[۲]

کیا اس معلّمِ اعظم کی کیمیا اثری کو کسی اور ثبوت کی حاجت ہے؟

رہی چراغ سے چراغ جلانے والی بات تو ابوبکر صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی مرتضیٰؓ، ابوعبیدہ بن جراحؓ، خالد بن ولیدؓ، سعد بن ابی وقاصؓ، عمرو بن العاصؓ جیسی تاریخ گر ہستیوں کے نام دربارِ محمدی کے علاوہ اور کہاں ملیں گے؛ اور یہ تو ایک

---

[۱] صحیح مسلم کتاب الحدود [۲] ایضاً

بہت مختصر فہرست ہے، ورنہ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس کے بہترین نمونے آپ نے
تیار نہیں کر دیئے تھے۔

(۳)

ڈاکٹر جانسن (DR. JOHNSON) نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور میں خراجِ
عقیدت ان الفاظ میں پیش کیا ہے :۔

" ان کا خالص تاریخی کردار، ان کی سادی اور بے ریا انسانیت کہ میں انسانوں
ہی میں سے ایک انسان ہوں ـــــ ان کی وہ پُرجوش حقیقت پسندی جو سارے پُراسرار
قسم کے دور از کار تخیلات کو نظر انداز اور مافوق العادت چیزوں کو رد کر دینے والی ہے
وہ مکمل جمہوری اور آفاقی تصور جس کے تحت ان کا آسمانی بادشاہت کا تصور رونما
ہوا تھا جس پر انھوں نے انسانوں کے باہمی تعلقات کی بنیاد رکھی تھی، وہ قوت جس کا
انحصار اخلاقیات پر تھا، ان کا وہ اعتماد جو انھیں زبان اور قلم پر تھا، یہ ساری چیزیں
محمد (صلعم) کا رشتہ عہد جدید سے جوڑنے والی ہیں[ل]۔"

تاریخ کا موجودہ دور علم و عقل، سائنس و حکمت کا دور ہے، ظن و قیاس،
مائیتھالوجی اور ایسٹرالوجی کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اسلام کا طلوع دراصل اسی دورِ جدید کا
طلوع ہے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ دنیا ظن و قیاس کے اندھیرے سے مشاہدہ و
عرفان کی روشنی میں اسلام ہی کے دروازے سے ہو کر آئی ہے اور پیغمبر اسلام
اس دورِ جدید کے بانی ہیں۔ کتنا صحیح لکھا ہے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے " یہی وہ
شخص ہے جس نے دنیا کا رخ توہمیت و عجائب پرستی اور رہبانیت کی طرف سے ہٹا کر

[ل] ADOPTED FROM, THE HOLY PROPHET AT A GLANCE

عقلیت و حقیقت پسندی اور منطقیانہ دنیاداری کی طرف پھیر دیا۔ اسی نے محسوس معجزے مانگنے والی دنیا میں عقلی معجزے سمجھنے اور انہی کو معیار صداقت ماننے کا مذاق پیدا کیا۔ اسی نے خرق عادت خدائی کے آثار ڈھونڈھنے والوں کی آنکھیں کھولیں اور آثارِ فطرت میں خدا کی نشانیاں دیکھنے کا خوگر بنایا۔ اسی نے عقل اور حس اور وجدان کے امتیازی اصول انسان کو بتائے، مادیت اور روحانیت میں مناسبت پیدا کی، دین سے علم و عمل کا اور علم و عمل سے دین کا ربط پیدا کیا۔ مذہب کی طاقت سے سائنٹفک اسپرٹ اور سائنٹفک اسپرٹ سے صحیح مذہبیت پیدا کی۔[۱]"

جامعیت اور کاملیت اور ہمیشہ محفوظ رہنے والی صفت رسول اللہ صلعم کی تعلیم پر ختم ہے بقول علامہ سید سلیمان ندوی "جس طرح اسلام کا خدا رب العالمین (تمام دنیا کا پروردگار) ہے اسی طرح اس کا رسول رحمۃ للعالمین (تمام دنیا کے لئے رحمت) ہے۔ اور اس کا پیغام تمام دنیا کے لئے پیغام ہے۔[۲]"

تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ	برکت والا ہے وہ اللہ جس نے اپنے
عَلٰى عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ	بندہ پر فیصلہ والی کتاب اتاری تاکہ وہ
نَذِیْرَا الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ	تمام دنیا کو ہشیار کرنے والا ہو۔ وہ خدا کہ
وَالْاَرْضِ (فرقان)	اسکی سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی۔

یہ ہے کائنات کی سروری اور یہ ہیں سرور کائنات!

اَللّٰهُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلَيْهِ وَعَلٰى اٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ
صَلٰوةً وَّسَلَامًا دَائِمًا اَبَدًا

۱؎ نبوت محمدی کا عقلی ثبوت ص ۱۲ ۲؎ خطبات مدراس ص ۱۴۹

ضمیمہ (۱)

چند خطبے

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ
وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ

"لوگوں کو دعوت دو اپنے پروردگار کی طرف حکمت سے
اور اچھی نصیحت سے۔" — (القرآن)

عرب فن خطابت میں امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ دراصل عربی زبان اپنے الفاظ اور محاوروں کے وسیع ذخیروں، شستہ ترکیبوں، سبک بندشوں، اچھوٹے چھوٹے فقروں میں وقار اور سنجیدگی کے ساتھ ترنم کی آمیزش اور دوسری صوتی و معنوی خوبیوں کے باعث تقریر و خطابت کے لئے دنیا کی تمام زبانوں میں زیادہ موزوں اور مناسب بھی ہے۔

اسلام سے پہلے بھی جب عربستان تمام تر جہالت و جاہلیت کی لپیٹ میں تھا وہاں زبان دانی کی بڑی قدر ہوتی تھی۔ ناخواندہ لوگ اعلیٰ درجے کی شاعری کرتے تھے اور ہر قبیلہ فصاحت و بلاغت میں دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش میں رہتا تھا۔ دو

قبیلے قریش اور بنو ہوازن اس بارہ میں بالخصوص ممتاز تھے۔ قریش خود آنحضرت صلعم کا قبیلہ تھا اور ہوازن کی ایک شاخ بنو سعد میں آپ کی پرورش ہوئی تھی، چنانچہ آپ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ "میں تم میں فصیح تر ہوں۔ قریشی ہوں اور میری زبان بنو سعد کی زبان ہے[1]"

وعظ و پند اور ارشاد و ہدایت کے لئے آپ اکثر خطبے دیا کرتے تھے۔ خطابت کا انداز نہایت سادہ تھا۔ جب خطبہ دینے آپ حجرہ سے تشریف لاتے تو نہ کوئی خاص لباس پہنے ہوتے اور نہ امتیاز و اعزاز کا کوئی اور سامان ہی ہوتا۔ نہ ہراول ہوتے نہ نقیب مسجد میں خطبہ کے وقت دستِ مبارک میں عصا ہوتا تھا اور میدانِ جنگ میں خطبہ دینے کھڑے ہوتے تو کمان پر ٹیک لگا لیتے تھے۔ ابن قیم نے لکھا ہے کہ آپ نے خطبہ کی حالت میں کبھی تلوار ہاتھ میں نہیں لی[2]۔

جمعہ اور عیدین کے خطبے ضروری تھے۔ ان کے علاوہ خطبہ کا کوئی وقت مقرر نہ تھا۔ جب ضرورت پیش آتی آپ لوگوں کو جمع کر کے مخاطب فرمایا کرتے تھے۔ ہمیشہ حمد خداوندی سے خطبہ شروع کرتے۔ عموماً خطبے نہایت مختصر ہوتے تھے۔ فرمایا کرتے تھے کہ نماز کا طول اور خطبہ کا اختصار آدمی کے تفقہ کی دلیل ہے۔ لیکن ضرورت کے لحاظ سے آپ نے طویل خطبے بھی دیئے ہیں۔ وعظ و ارشاد کے لئے عام طور پر ناغہ دیکر خطبہ دیتے تھے کہ لوگ گھبرا نہ جائیں۔ ابن مسعود سے روایت ہے کہ "نبی صلعم ہم کو گاہ بگاہ ہی وعظ سناتے تھے کہ کہیں روزانہ وعظ سننا ہم پر گراں نہ گزرے[3]"۔ کبھی کبھی سوال کی صورت میں خطبہ شروع کرتے تھے۔ غزوۂ حنین والا خطبہ اوّل سے آخر تک

---

[1] طبقات ابن سعد، ص۷۱ [2] زاد المعاد جلد اوّل [3] صحیحین

سوال و جواب ہی کے انداز میں ہے۔

اکثر خطبہ کے وقت آپ پر والہانہ کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حضرت عبداللہؓ بن عمر نے اس کی تصویر ان الفاظ میں کھینچی ہے۔ "آنحضرت صلعم کو خطبہ دیتے سُنا فرما رہے تھے کہ خداوند صاحبِ جبروت زمین و آسمان اپنے ہاتھ میں لے لیگا۔ یہ بیان کرتے ہوئے آپ مٹھی بند کر لیتے تھے اور پھر کھول دیتے تھے۔۔۔۔۔۔۔ جسم مبارک کبھی داہنے اور کبھی بائیں جھکتا جاتا تھا یہانتک کہ میں نے منبر کو دیکھا تو وہ اس قدر ہل رہا تھا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ کہیں آپ کو لے کر گر تو نہیں پڑے گا۔"[1]

خطبوں میں سادگی کے ساتھ تاثیر بھی بہت ہوتی تھی۔ مکہ میں ایک بار آپ نے سورۂ والنجم کی آیتیں تلاوت کر کے سنائیں تو یہ اثر ہوا کہ مسلمان تو مسلمان بہت سے کفار بھی سجدہ میں گر پڑے۔"[2]

ایک دفعہ ایک نو مسلم قبیلہ ہجرت کر کے مدینہ آیا۔ اس کو امداد کی ضرورت تھی۔ آپ نے مسلمانوں کو مسجدِ نبوی میں جمع کر کے خطبہ دیا، پہلے چند آیاتِ قرآنی تلاوت فرمائیں، پھر کہا "درہم، کپڑا، غلّہ، بلکہ چھوہارہ کا ایک ٹکڑا جو بھی ہو راہِ خدا میں دو۔" مدینہ میں مسلمانوں کی مالی حالت جیسی ابتر تھی وہ تھی ہی۔ لیکن آپ کی تقریر کا ایسا اثر پڑا کہ ہر صحابی نے جو اسکے پاس تھا سامنے رکھ دیا اور بعض نے تو کپڑے تک اتار دیئے۔[3]

فتح مکہ پر جب آپ نے انصار کی توقع کے خلاف رؤسائے قریش کی جاں بخشی فرمادی تو ان میں سے وہ جو خُلقِ محمدی سے پوری طرح آگاہ نہ تھے، معترض ہوئے کہ آخر آپ کو وطن اور خون کی محبت آہی گئی۔ آپ کو اطلاع ہوئی تو انصار سے تصدیق کی اور ان کے

---

[1] ابن ماجہ (ماخوذ از سیرۃ النبی، جلد ۲) [2] صحیح بخاری، سورۂ والنجم [3] صحیح مسلم باب الصدقہ

اقرار کرنے پر آپ نے فرمایا "وطن اور خاندان کی پاسداری میرے پیش نظر نہ تھی۔ میں خدا کا بندہ اور اس کا فرستادہ ہوں۔ میں نے اللہ کی طرف ہجرت کی .... اب میرا جینا تمھارا جینا ہے اور میرا مرنا تمھارا مرنا ہے۔" انصار کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

سخت سے سخت اشتعال کے موقع پر آپ کے چند جملے معاملہ کو رفع دفع کر دیتے تھے اور سالہا سال کی عداوتیں دم کے دم میں ختم ہو جاتی تھیں۔ غزوہ مصطلق سے واپسی میں ایک موقع پر منافقوں نے فتنہ برپا کیا اور معاملہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ معلوم ہوتا تھا کہ مہاجر و انصار آپس میں گتھ جائیں گے۔ آپ کو خبر پہنچی تو تشریف لائے اور اسطرح تقریر کی کہ دونوں پھر ایک ہو گئے۔

ایک بار اوس اور خزرج میں اتنی کشیدگی بڑھی کہ لوگوں نے سمجھا کہ خاص مسجد نبوی ہی میں تلواریں چمکنے لگیں گی۔ آپ کی تقریر سے ان میں پھر برادرانہ محبت کی موجیں جاری ہو گئیں۔

اب آنحضرت صلعم کے چند خطبوں کے ترجمے ملاحظہ کیجیے۔

(۲)

یہ خطبہ مدینہ منورہ میں ۱۲ ربیع الاول سنہ ۱ھ کو بنو سالم میں دیا گیا تھا:-

"حمد و ستائش خدا کے لئے ہے۔ میں اس کی حمد کرتا ہوں (اور) مدد، بخشش اور ہدایت اسی سے چاہتا ہوں۔ میرا ایمان اسی پر ہے اور میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ (اسکی) نافرمانی کرنے والوں سے میں عداوت رکھتا ہوں، میری شہادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق نہیں۔ وہ یکتا ہے۔ لاشریک ہے۔ محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اسی نے محمد کو ہدایت، نور اور نصیحت کے ساتھ ایسے زمانے میں بھیجا ہے

کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہ آیا تھا۔ علم گھٹ گیا تھا اور گمراہی بڑھ گئی تھی۔ وہ آخری زمانے میں قیامت کے قریب اور موت کی نزدیکی کے وقت بھیجا گیا ہے۔

"جو شخص خدا اور رسول کی اطاعت کرتا ہے وہ کامیاب ہے اور جس نے ان کا حکم نہ مانا وہ بھٹک گیا، درجہ سے گر گیا اور بڑی گمراہی میں مبتلا ہو گیا۔

"مسلمانو! میں تمھیں اللہ سے تقویٰ کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین وصیت جو مسلمان مسلمان کر سکتا ہے یہ ہے کہ اسے آخرت کے لئے آمادہ کرے اور اللہ سے تقویٰ کے لئے کہے۔

"لوگو! جن باتوں سے خدا نے تم کو پرہیز کرنے کے لئے کہا ہے۔ ان سے بچو۔ اس سے بڑھ کر نہ کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر۔

یاد رکھو۔ امورِ آخرت کے بارہ میں جو ڈر کر کام کر رہا ہے، تقویٰ اس کا بہترین مددگار ثابت ہوگا، اور جو شخص خدا سے اپنا ظاہری اور باطنی معاملہ درست کر لیگا۔ اور اس کی نیت خالص ہو گی تو ایسا کرنا اسکے لئے دنیا میں نیکنامی کا اور موت کے بعد کا، جب انسان کو اعمال کی قدر و قیمت معلوم ہو گی، سرمایہ بن جائے گا۔

اور جو شخص ایسا نہیں کرے گا وہ (قیامت میں) چاہے گا کہ اس کے اعمال اس سے دور ہی رکھے جائیں۔ خدا تم کو اپنے سے ڈراتا ہے اور خدا تو اپنے بندوں پر بہت ہی مہربان ہے۔

جس نے اللہ کے حکم کو سچ جانا اور اسکے وعدوں کو پورا کیا تو اسکی بابت یہ ارشاد الٰہی موجود ہے کہ ہمارے ہاں بات نہیں بدلتی اور ہم اپنے ناچیز بندوں پر ظلم نہیں کرتے حال اور مستقبل میں اپنے تمام ظاہر اور خفیہ کاموں میں اللہ سے تقویٰ کو پیش نظر رکھو، کیونکہ تقویٰ والوں کی بدیاں چھوڑ دی جاتی ہیں اور ان کا اجر بڑھا دیا جاتا ہے۔"

"تقویٰ والے وہ ہیں جو بہت بڑی مراد کو پہنچیں گے۔ یہ تقویٰ ہی ہے جو اللہ کی بیزاری اور عذاب اور غصّہ کو دور کر دیتا ہے۔"

"یہ تقویٰ ہی ہے جو چہرہ کو نورانی، پروردگار کو راضی اور رتبہ کو بلند بنا دیتا ہے۔"

"مسلمانو! حظ اٹھاؤ مگر حقوق الٰہی میں فرو گزاشت نہ کرتے ہوئے۔ خدا نے اسی لئے تم کو اپنی کتاب سکھائی ہے اور بشارت دی ہے کہ راست بازوں اور کاذبوں کو الگ الگ کر دیا جائے۔"

لوگو! خدا نے تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کیا ہے۔ تم بھی لوگوں کے ساتھ ایسا ہی کرو اور جو خدا کے دشمن ہیں ان کو دشمن سمجھو اور اللہ کے راستہ میں پوری ہمت اور توجہ سے کوشش کرو۔ اس نے تم کو برگزیدہ کیا اور تمھارا نام مسلمان رکھا کہ ہلاک ہونے والا بھی روشن دلائل پر ہلاک ہو اور زندگی پانے والا بھی روشن دلائل پر زندگی پائے اور یہ سب اللہ کی مدد سے ہے۔"

"لوگو! اللہ کا ذکر کرو اور آنے والی زندگی کے لئے عمل کرو جو شخص اللہ کے ساتھ اپنا معاملہ درست کر لیتا ہے اللہ اس کے ساتھ اپنا معاملہ درست کر دیتا ہے۔ خدا بندوں پر حکم چلاتا ہے اور اس پر کسی کا حکم نہیں چلتا۔ خدا بندوں کا مالک ہے اور بندوں کا اس پر کچھ اختیار نہیں ہے۔ خدا سب سے بڑا ہے اور ہم کو (نیکی کرنے) کی طاقت اسی عظمت والے سے ملتی ہے۔"

(۳)

بمقام تبوک، ماہ رجب سنہ ۹ھ

'سچائی میں ہر کلام سے بڑھ کر اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بڑھ کر بھروسہ کی بات تقویٰ کا کلمہ ہے اور سب ملتوں میں بڑھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت ہے اور

اور سب طریقوں میں بڑھ کر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے۔"

"سب باتوں پر اللہ کے ذکر کو شرف حاصل ہے۔ سب واقعات سے پاکیزہ تر یہ قرآن ہے اور بہترین کام اولو العزمی کے کام ہیں اور امور میں بدترین امر وہ ہے جو نیا نکالا گیا ہو۔"

"انبیاء کی روش سب روشوں سے اچھی ہے اور شہید کی موت تمام موتوں میں بہتر ہے سب سے بڑا اندھاپن وہ گمراہی ہے جو ہدایت پانے کے بعد ہو جائے اور علموں میں وہ علم سب سے اچھا ہے جو نفع بخش ہو۔ اور بہترین روش وہ ہے جس پر لوگ چل سکیں۔ بدترین کوری دل کی کوری ہے۔ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے (یعنی دینا لینے سے اچھا ہے) تھوڑا اور ضرورت بھر کا مال اُس افراط سے اچھا ہے جو غفلت میں ڈال دے۔"

"بدترین معذرت وہ ہے جو جان کنی کے وقت کی جائے اور بدترین ندامت وہ ہے جو قیامت کو ہوگی۔"

بعض لوگ جمعہ کو آتے ہیں مگر ان کے دل کہیں اور لگے ہوتے ہیں اور بعض ایسے آتے ہیں جو بس کبھی کبھی اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔"

سب گناہوں میں عظیم تر جھوٹی بات ہے اور سب سے بڑی تونگری دل کی تونگری ہے اور سب سے بڑا توشہ تقویٰ ہے۔ اور دانائی کا راز یہ ہے کہ خدا کا خوف دل میں ہو اور اپنے اندر پیدا کرنے کے لئے بہترین چیز یقین ہے اور شک کفر (کی شاخ) ہے۔"

"بین سے رونا جاہلیت کی بات ہے اور چوری کرنا عذاب جہنم کا سامان ہے اور بدمست ہونا آگ میں کودنا ہے اور شعر ابلیس کا حصّہ ہے اور شراب تمام گناہوں کا مجموعہ ہے اور بدترین روزی یتیم کا مال کھانا ہے اور سعادت مند وہ ہے جو دوسروں

سے نصیحت حاصل کرے۔ درحقیقت بدبخت وہ ہے جو ماں کے پیٹ ہی میں بدبخت ہو جائے۔"

"عمل کا سرمایہ اسکا بہترین انجام ہے۔ بدترین خواب وہ ہے جو جھوٹا ہو۔ جو بات ہونے والی ہے (یعنی قیامت) وہ بہت قریب ہے۔

"مومن کو گالی دینا فسق ہے اور مومن کو قتل کرنا کفر ہے اور مومن کا گوشت کھانا (یعنی اس کی غیبت کرنا) اللہ کی معصیت ہے اور مومن کا مال دوسروں پر ایسا ہی حرام ہے جیسا کہ اس کا خون۔"

"جو خدا سے استغنا کرتا ہے خدا اسکو جھٹلاتا ہے اور جو دوسروں کے عیوب چھپاتا ہے خدا اس کے عیوب پر پردہ ڈالتا ہے اور جو معاف کرتا ہے اسے معافی دی جاتی ہے اور جو غصہ پی جاتا ہے خدا اسکو اجر دیتا ہے اور جو نقصان پر صبر کرتا ہے خدا اسکو نعم البدل بخشتا ہے اور جو چغلی کو پھیلاتا ہے خدا اس کی رسوائی عام کر دیتا ہے اور جو صبر کرتا ہے خدا اسے بڑھاتا ہے اور جو خدا کی نافرمانی کرتا ہے خدا اسے عذاب میں ڈالتا ہے۔"

(۴)

آپ کے کمسن فرزند حضرت ابراہیم کے انتقال کے دن سورج میں گہن لگنے پر جب لوگوں نے مزعومات عرب کے مطابق یہ خیال ظاہر کیا کہ گہن اس سانحہ کے سبب سے تھا تو آپنے یہ خطبہ دیا:۔

"حمد و ثنا کے بعد، لوگو! آفتاب و ماہتاب خدا کی دو نشانیاں ہیں، جو کسی کے مرنے سے تاریک نہیں ہوتیں۔

"جس چیز کو میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا اسے یہیں دیکھ لیا، حتّٰی کہ جنت و دوزخ کو بھی، اور ہاں، مجھے وحی کی گئی ہے کہ تم قبروں میں آزمائے جاؤ گے، جس طرح کہ دجّال

سے آزمائے جاؤ گے۔ تم میں سے ہر ایک کے پاس ایک آنے والا آئے گا اور پوچھیگا کہ اس شخص (یعنی خود آں حضرت صلعم) کی نسبت تم کیا جانتے ہو۔ یقین والے کہیں گے کہ یہ محمدؐ ہیں، خدا کے رسول ہیں، جو خدا کی نشانیاں اور ہدایتیں لے کر آئے، ہم نے ان کو قبول کیا اور ان کی پیروی کی۔ اور شک کرنے والے کہیں گے کہ ہم نہیں جانتے۔ جو لوگوں کو کہتے سنا وہ ہم نے بھی کہدیا۔

میرے سامنے وہ تمام مقامات پیش ہوئے جن میں تم داخل ہو گے تا آنکہ اگر میں چاہتا تو اس کا پھل توڑ لیتا، لیکن میرے ہاتھ رک گئے اور دوزخ میرے سامنے لائی گئی میں نے اس میں ایک عورت کو دیکھا جس کو صرف اس لئے سزا دی جا رہی تھی کہ اس نے ایک بلی کو باندھ رکھا تھا۔ نہ اس کو خود کچھ کھانے کو دیتی تھی نہ چھوڑتی تھی کہ زمین کی گری پڑی کوئی چیز کھالے۔ میں نے دوزخ میں ابو ثمامہ، عمرو ابن مالک کو دیکھا یہ وہ لوگ تھے جو کہتے تھے کہ آفتاب و ماہتاب میں کسی بڑے آدمی کی موت سے گہن لگتا ہے، حالانکہ وہ تو خدا کی نشانیاں ہیں۔ جب تم گہن دیکھو تو نماز کے لئے کھڑے ہو جاؤ تا آنکہ وہ صاف ہو جائے۔"

(۵)

خطبۂ حجۃ الوداع :۔

"لوگو! میں خیال کرتا ہوں کہ میں اور تم پھر کبھی اس مجلس میں اکٹھا نہ ہوں گے۔

"لوگو! تمھارا خون، تمھارا مال اور تمھاری آبرو ایک دوسرے پر ویسے ہی حرام ہے جیسے کہ تم آج کے دن کی، اس مہینہ کی اور اس شہر کی حرمت کرتے ہو۔

"لوگو! تمھیں عنقریب خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے اور وہ تم سے تمھارے اعمال

کی بابت دریافت فرمائے گا۔ خبردار میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔"

"لوگو! جاہلیت کی ہر ایک بات کو میں اپنے قدموں کے نیچے پامال کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام خون (یعنی انتقام خون) باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا خون، ربیعہ بن الحارث کا خون باطل کرتا ہوں۔ جاہلیت کے تمام سود بھی باطل کر دیئے گئے۔ اور سب سے پہلے میں اپنے خاندان کا سود، عباسؓ بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں۔"

"لوگو! اپنی بیویوں کے متعلق اللہ سے ڈرتے رہو، خدا کے نام کی ذمہ داری سے تم نے ان کو بیوی بنایا ہے اور خدا کے کلام سے تم نے ان کا جسم اپنے لیے حلال کیا ہے۔ تمہارا حق تمہاری عورتوں پر اتنا ہے کہ وہ اپنے بستر پر کسی غیر مرد کو نہ آنے دیں۔ لیکن اگر وہ ایسا کریں تو ان کو ایسی مار مارو کہ تکلیف دہ نہ ہو۔ عورتوں کا حق تم پر یہ ہے کہ ان کو اچھا کھلاؤ، اچھا پہناؤ۔"

"لوگو! میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑے جاتا ہوں کہ اگر اسے مضبوط پکڑ لوگے تو کبھی گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز قرآن، اللہ کی کتاب ہے۔

"لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی اور پیغمبر ہے اور نہ کوئی نئی امت ہی پیدا ہونے والی ہے۔ خوب سن لو، اپنے پروردگار کی عبادت کرو اور نماز پنجگانہ ادا کرو۔

سال بھر میں ایک مہینہ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے زر و مال کی زکوٰۃ نہایت خوشی کے ساتھ دیا کرو۔ خانۂ کعبہ کا حج بجا لاؤ اور اپنے اولیائے امور و حکام کی اطاعت کیا کرو۔ اس کی جزا یہ ہے کہ تم اللہ کی فردوس بریں میں داخل ہوگے۔

"لوگو! قیامت میں تم سے میری بابت بھی دریافت کیا جائے گا۔ ذرا مجھے بتاؤ کہ کیا جواب دو گے؟

دسب نے کہا کہ "ہم شہادت دیتے ہیں کہ آپ نے اللہ کے احکام ہم تک پہنچا دیئے۔ آپ نے رسالت کا حق ادا کر دیا۔ آپ نے کھرے اور کھوٹے کا فرق اچھی طرح ظاہر کر دیا۔"

یہ سن کر آپ نے کلمہ کی اُنگلی آسمان کی طرف اٹھائی اور فرمایا "اے اللہ! تو گواہ رہ۔")

"دیکھو وہ جو موجود ہیں ان کو جو موجود نہیں ہیں یہ باتیں پہنچاتے رہیں ممکن ہے موجود ہونے والوں کے مقابلہ میں موجود نہ ہونے والے اس کلام کو زیادہ یاد رکھنے والے اور اس کی زیادہ حفاظت کرنے والے ثابت ہوں۔"

(۶)

اور آخر میں حضور سرورِ کائنات کا آخری خطبہ :۔

"لوگو! مرحبا! خدا کی نصرت، سلامتی اور حفاظت تمہارے ساتھ ہو، خدا تمھیں رفعت، ہدایت اور توفیق عطا فرمائے۔ خدا تمھیں اپنی پناہ میں رکھے۔ آفات سے بچائے اور سلامت رکھے۔

"میں تم کو تقویٰ اور خدا ترسی کی وصیت کرتا ہوں اور تم کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہوں۔ اور امید کرتا ہوں کہ تم بھی لوگوں کو اس سے ڈراتے رہو گے۔

"تم کو لازم ہے کہ سرکشی، تکبّر اور اینٹھ کر چلنے کو خدا کے بندوں میں اور خدا کی بستیوں میں نہ پھیلنے دو۔ آخرت کا گھر انہی کیلئے ہے جو دنیا میں اینٹھ کر نہیں چلتے اور فساد نہیں پیدا کرتے۔

"اچھی عاقبت صرف متقی لوگوں کی ہے۔ میں ان فتوحات کو دیکھ رہا ہوں جو تم کو حاصل ہونگی مجھے یہ خوف تو نہیں ہے کہ تم شرک میں مبتلا ہو جاؤ گے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ دنیا کی رغبت اور فتنہ میں پڑ کر کہیں ہلاک نہ ہو جاؤ، جس طرح تم سے پہلے اُمّتیں ہلاک ہوئیں۔"

ضمیمہ (۲)

حدیثیں

وَاِنَّکَ لَتَھْدِیْٓ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ صِرَاطِ اللّٰہِ

(بے شک تم سیدھے راستہ کی طرف ہدایت کرتے ہو۔ سیدھا راستہ اللہ کا ہے)

(القرآن ــــ شوریٰ)

جو ہدایت ربّانی رسول مقبول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے دنیا کو پہنچی اس کے دو حصے ہیں۔ ایک قرآن مجید اور دوسرے حدیث و سنّت۔

حدیث آپ کی ان تمام قولی اور سنّت ان تمام عملی ہدایات و تعلیمات کو کہتے ہیں جو آپ اللہ کے نبی اور اس کی کتاب کے شارح کی حیثیت سے اُمّت کو دیتے تھے۔

ذیل میں ہم آپ کی چند احادیث یعنی اقوال و ارشادات پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔ ان میں ہم کو اس اسلامی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں جو آپ کی ذات اقدس میں پوری طرح جلوہ گر تھی اور طالبانِ ہدایت ان سے آج بھی وہ روشنی حاصل کر سکتے ہیں جو آپ کے دور میں اس پر ایمان لانے والے آپ کی منوّر ہستی سے حاصل کیا کرتے تھے۔

(۲)

(۱) لَآ اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہ کی شہادت دینا جنت کی کنجی ہے

(۲) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو خواہ تم کو مار ڈالا جائے یا جلا دیا جائے۔

(۳) آدمی کو اس کی نیت کے مطابق ہی اس کے عمل کا پھل ملتا ہے

(۴) جب تم کو اپنے اچھے عمل سے مسرت ہو اور برے کام سے رنج و قلق ہو تو تم مومن ہو۔

(۵) جب تم سے کوئی برا کام ہو جائے تو فوراً نادم ہو اور سچے دل سے توبہ کر کے نیکی میں لگ جاؤ۔

(۶) احسان اس کا نام ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا کہ تم اسکو دیکھ رہے ہو۔ کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھ سکتے وہ تو تم کو دیکھتا ہے۔

(۷) خدا تمہاری صورت اور تمہارے مالوں کو نہیں دیکھتا وہ تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔

(۸) انسان کے بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جو اگر درست ہے تو تمام بدن درست ہے اور اگر وہ بگڑ گیا تو تمام بدن بگڑ گیا، وہ ٹکڑا دل ہے۔

(۹) پرہیزگاری عمل کی سرداری ہے

(۱۰) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشاتِ نفس میری لائی ہوئی ہدایات کے تابع نہ ہو جائیں۔

(۱۱) دعا خلاصۂ عبادت ہے

(۱۲) نماز دین کا ستون ہے۔

(۱۳) جس کی نماز اس کو بدی اور برائی سے نہ روکے وہ اسے خدا سے دور کر دیتی ہے۔

(۱۴) روزہ رکھ کر جو شخص جھوٹ اور فریب کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں کہ وہ کھانا پینا چھوڑ دے۔

(۱۵) کسی بندہ کو صبر سے زیادہ وسیع کوئی چیز عطا نہیں ہوئی۔

(۱۶) ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔

(۱۷) جھوٹ سے ہمیشہ بچتے رہو، کیونکہ جھوٹ بولنے کی عادت آدمی کو بدکاری کے راستہ پر ڈال دیتی ہے۔

(۱۸) یہ بھی بہت بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی جھوٹی بات بیان کرو درانحالیکہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔

(۱۹) جس میں امانت کی خصلت نہیں اس میں ایمان نہیں جس میں عہد کی پابندی نہیں اس میں دین نہیں۔

(۲۰) میں حُسنِ اخلاق کی تکمیل کے لئے بھیجا گیا ہوں۔

(۲۱) اچھے خلق ہی کو اسلام کہتے ہیں۔

(۲۲) تم میں سب سے اچھا آدمی وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں۔

(۲۳) انسان حسنِ اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر نماز پڑھنے سے ملتا ہے۔

(۲۴) تمھارے مال لوگوں کو کفایت نہیں کر سکتے، ہاں تمھارے اخلاق کفایت کر سکتے ہیں۔

(۲۵) لوگوں کے لئے اپنے اخلاق کو بہتر بناؤ۔

(۲۶) ہر نیکی اور احسان صدقہ ہے۔

(۲۷) جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا وہ سارے خیر سے محروم کیا گیا۔

(۲۸) اللہ خود مہربان ہے اور نرمی اور مہربانی اسے محبوب بھی ہے۔

(۲۹) مومن تو الفت و محبت کا مرکز ہے۔ اس شخص میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے الفت نہیں کرتا، اور دوسرے اس سے اُلفت نہیں کرتے۔

(۳۰) جس بندہ نے بھی اللہ کے لئے کسی بندے سے محبت کی اس نے اپنے ربّ عزّوجل ہی کی عظمت و توقیر کی۔

(۳۱) اچھی اور میٹھی بات بھی ایک صدقہ ہے

(۳۲) زمین پر بسنے والی اللہ کی مخلوق پر تم رحم کرو تو آسمان والا تم پر رحمت کریگا۔

(۳۳) نہیں نکالا جاتا رحمت کا مادّہ مگر بدبخت کے دل سے۔

(۳۴) سخت گو اور درشت خو آدمی جنّت میں نہ جائے گا۔

(۳۵) غصّہ ایمان کو خراب کرتا ہے جیسے کہ ایلوا شہد کو خراب کرتا ہے۔

(۳۶) مومن لعن طعن کرنے والا نہیں ہوتا اور نہ فحش گو اور بدکلام ہوتا ہے۔

(۳۷) جو شخص کسی ظالم کی مدد کے لئے اور اس کا ساتھ دینے کے لئے چلا اور اس کو اس بات کا علم تھا کہ یہ ظالم ہے تو وہ اسلام سے نکل گیا۔

(۳۸) وہ مومن نہیں جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں اور آفتوں کی وجہ سے خائف رہتے ہوں۔

(۳۹) اصلاح ذات البین کا درجہ نماز، روزہ وغیرہ عبادات سے زیادہ ہے۔

(۴۰) تم میں کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لئے وہی نہ چاہے جو اپنے لئے چاہتا ہے۔

(۴۱) مسلم وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے جس کی طرف سے لوگوں کو اپنی جانوں اور مالوں کے بارہ میں کوئی خطرہ نہ ہو۔

(۴۲) تم دوسروں کے متعلق بدگمانی سے بچو، کیونکہ بدگمانی سب سے جھوٹی بات ہے۔

(۴۳) تم کسی کی کمزوریوں کی ٹوہ میں نہ رہا کرو اور جاسوسوں کی طرح کسی کے عیوب معلوم کرنے کی کوشش نہ کیا کرو۔

(۴۴) حسد آدمی کی نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جس طرح کہ آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔

(۴۵) تم اپنے کسی بھائی کی مصیبت پر خوشی کا اظہار مت کرو اگر ایسا کروگے تو ہو سکتا ہے کہ اللہ اس کو اس مصیبت سے نجات دیدے اور تم کو مبتلا کردے

(۴۶) حرص و بخل اور ایمان کبھی ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔

(۴۷) انسان کو سب سے زیادہ کڑھا دینے والی بات حرص ہے اور سب سے زیادہ گھبرا دینے والی بات بزدلی۔

(۴۸) اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "تم دوسروں پر خرچ کرتے رہو میں تم پر خرچ کرتا رہوں گا"

(۴۹) کسی بندہ کا مال صدقہ کی وجہ سے کم نہیں ہوتا۔

(۵۰) وہ شخص مومن نہیں جو خود شکم سیر ہو کر کھائے اور اس کا پڑوسی فاقہ سے رہے۔

(۵۱) اصلی دولتمندی دل کے اندر ہوتی ہے اور اصلی فقیری اور محتاجی بھی دل ہی کے اندر رہوتی ہے۔

(۵۲) جو دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے اپنے کو بچانا چاہتا ہے تو اللہ اس کی مدد فرماتا ہے اور اسے سوال کی ذلت سے بچا دیتا ہے اور جو بندوں کا محتاج اور نیاز مند بننا نہیں چاہتا، اللہ تعالیٰ اسے بندوں سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔

(۵۳) جو شخص سوال کا دروازہ کھولتا ہے اللہ تعالیٰ اس پر فقر و محتاجی کا دروازہ کھول دیتا ہے۔

(۵۴) جو بندہ کسی جانی یا مالی مصیبت میں مبتلا ہو اور کسی سے اس کا اظہار نہ کرے اور نہ لوگوں سے شکوہ شکایت کرے تو اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہے کہ وہ اسے بخش دینگے۔

(۵۵) جس نے اپنے محسنوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر بھی نہیں ادا کیا۔

(۵۶) آدمی کے اسلام کی خوبی اور اس کے کمال میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ فضول اور غیر مفید باتوں کا تارک ہو۔

(۵۷) آدمیوں کو جہنم میں اوندھے منہ ان کی بکواس ہی ڈالے گی۔

(۵۸) بُرے ساتھی کی ہمنشینی سے اکیلے رہنا بہتر ہے اور اچھے ساتھی کیساتھ بیٹھنا تنہائی سے بہتر ہے اور کسی کو اچھی باتیں بتانا خاموش رہنے سے بہتر ہے اور بُری باتیں بتلانے سے خاموش رہنا بہتر ہے۔

(۵۹) چغل خور آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا۔

(۶۰) دنیا میں جو شخص دو رُخا ہوگا، قیامت کے دن اسکے منہ میں آگ کی دو زبانیں ہوں گی۔

(۶۱) وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جس کے دل میں ذرہ برابر بھی تکبر ہوگا۔

(۶۲) میانہ روی ایک اچھا عمل ہے۔

(۶۳) ہر امت کے لئے کوئی خاص آزمائش ہوتی ہے اور میری امت کی خاص آزمائش مال ہے۔

(۶۴) دنیا میں اس طرح رہو گویا کہ تم کوئی پردیسی یا مسافر ہو۔

(۶۵) اپنے درمیان سلام کا رواج پھیلاؤ اور اسے عام کرو۔

(۶۶) نیکیوں میں ایک بڑی نیکی یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کے انتقال کے بعد بھی ان کے دوستوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

(۶۷) دنیا آخرت کی کھیتی ہے

(۶۸) دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو اسے صحیح طور پر خرچ کرے اس کے لئے بہترین مددگار ہے اور جو اسے صحیح طور پر خرچ نہیں کرتا اس کی مثال ایسی ہے کہ کھاتا جائے اور سیر نہ ہو۔

(۶۹) چار عادتیں ایسی ہیں کہ جس میں وہ چاروں جمع ہو جائیں وہ خالص منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں سے کوئی ایک خصلت ہو تو اس کا حال یہ ہے کہ اس میں منافق کی ایک خصلت ہے اور وہ اسی حالت میں رہے گا۔ جبتک کہ وہ عادت چھوڑ نہ دے۔ وہ چاروں عادتیں یہ ہیں۔ جب اس کو کسی امانت کا امین بنایا جائے تو اس میں خیانت کرے، جب بولے تو جھوٹ بولے، جب عہدہ و معاہدہ کرے تو اسکے خلاف کرے اور جب کسی سے جھگڑا یا اختلاف کرے تو بدزبانی کرے۔

(۷۰) جو کوئی تم میں سے کوئی بری یا خلاف شرع بات دیکھے تو لازم ہے کہ اگر طاقت رکھتا ہو تو اپنے ہاتھ سے (یعنی زور و قوت سے) اسکو بدلنے کی (یعنی درست کرنے کی) کوشش کرے اور اگر اسکی طاقت نہ رکھتا ہو تو پھر اپنی زبان ہی سے اسکو بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اسکی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل ہی سے اسکو برا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

ضمیمہ (۳)

دُعائیں

رَبِّ اِنِّی اَعُوذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَیْسَ لِی بِهٖ عِلْمٌ

(خداوندا! تیری پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ تجھ سے کوئی جاہلانہ سوال کروں)

دعا کو ایک حدیث میں عبادت کا مغز بتایا گیا ہے۔ اسی کے ساتھ ہم اسکو صاحبِ دعا کے نفس کا نچوڑ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جب کوئی شخص اپنے حقیقی آقا و مولا کے حضور میں اپنی کوئی التجا پیش کرتا ہے تو اس وقت اس کی شخصیت پر سے سارے پردے اٹھ جاتے ہیں اور اس کے دل کے چھپے ہوئے احساسات بلا کسی ملاوٹ کے الفاظ کے سانچوں میں ڈھل کر اس کی زبان پر آجاتے ہیں۔ ان الفاظ سے جو اس وقت اس کی زبان سے ادا ہوتے ہیں ہم اس کے ایمان و اخلاق اور اس کی معاشرت اور طرزِ زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ آنحضرت صلعم کی زندگی میں چونکہ دعا کو ایک بڑی ہی ممتاز جگہ حاصل تھی اور اللہ پاک سے اپنی ہر حاجت کا سوال گویا کہ آپ کی فطرت بن گیا تھا،

اس لئے آپ کی سیرت کے مطالعہ میں آپ کی دعائیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ اسی غرض سے ہم اس کتاب کا خاتمہ آپ کی دعاؤں کے ذیل کے مختصر سے مجوعہ پر کر رہے ہیں:۔

حدیث شریف کی دعاؤں کا مطالعہ کرتے وقت نبی صلعم کی روحانیت اور تعلق باللہ، خلوص اور شوق دعا اور آپ کی انسانیت دوستی اور دردمندی کے علاوہ جو چیز ہم کو متاثر کرتی ہے وہ انسانی زندگی اور اس کی ضروریات سے آپ کی واقفیت ہے جس نے ان دعاؤں میں دین و دنیا کی ایک انوکھی جامعیت پیدا کردی ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کے آئینہ میں بار بار ہم کو خود اپنی تصویر نظر آتی رہتی ہے اور ہم جس حال میں بھی ہوں، یہ ہماری تسکین کا باعث بنجاتی ہیں۔

ایک اور فائدہ ان دعاؤں میں یہ بھی ہے کہ جس سوز و گداز اور ضمیر انسانی کے جن احساسات کی یہ ترجمان ہیں ان کو اپنے اندر پیدا کرنے کا یہ ایک آسان اور موثر ذریعہ ہیں۔ جو لوگ سچے دل سے ان کو اپنا ورد و معمول بنالیں گے وہ انشاء اللہ دیکھیں گے کہ کسی نہ کسی درجہ میں یہ دولت ان کو ضرور حاصل ہوجائے گی۔

(۲)

اَللّٰھُمَّ لَكَ الْحَمْدُ كُلُّهٗ، وَلَكَ الشُّكْرُ كُلُّهٗ، وَلَكَ الْمُلْكُ كُلُّهٗ وَلَكَ الْخَلْقُ كُلُّهٗ، بِيَدِكَ الْخَيْرُ كُلُّهٗ

اے اللہ! ساری حمد و ثنا صرف تیرے ہی لئے ہے اور شکر سب کا سب صرف تیرے ہی لئے ہے، اور ملک سارے کا سارا صرف تیرا ہی ہے اور خلقت سب کی سب صرف

وَإِلَيْكَ يَرْجِعُ الْأَمْرُ كُلُّهٗ	تیری ہی ہے۔ ساری بھلائیاں بس
أَسْئَلُكَ الْخَيْرَ كُلَّهٗ وَأَعُوْذُ	تیرے ہی ہاتھ میں ہیں اور ہر چیز کا
بِكَ مِنَ الشَّرِّ كُلِّهٖ	مرجع تو ہی ہے۔ اے اللہ! ساری

بھلائیوں اور اچھائیوں کا میں تجھ سے سوال کرتا ہوں اور ساری برائیوں کی تجھ سے پناہ مانگتا ہوں۔

(۲) اَللّٰهُمَّ رَبَّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ	اے ساتوں آسمانوں کے پروردگار اور
وَرَبَّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ اَللّٰهُمَّ	اے عرش عظیم کے مالک! اے میرے
اكْفِنِيْ كُلَّ مُهِمٍّ لِّيْ مِنْ حَيْثُ	اللہ! میری ہر مہم اور حالت کے لئے تو ہی
شِئْتَ وَمِنْ أَيْنَ شِئْتَ	کافی ہو جا جس طرح کہ تو چاہے اور جہاں سے
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِدِيْنِيْ حَسْبِيَ اللّٰهُ	تو چاہے میرے دین کے لئے میرا اللہ
لِدُنْيَايَ، حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَا أَهَمَّنِيْ	کافی، میری دنیا کے لئے میرا اللہ کافی،
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ بَغٰى عَلَيَّ	میری سب فکروں کیلئے میرا اللہ کافی،
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ حَسَدَنِيْ	جو کوئی مجھ پر زیادتی کرے اس سے مجھے
حَسْبِيَ اللّٰهُ لِمَنْ كَادَنِيْ بِسُوْءٍ	میرا اللہ کافی، جو کوئی مجھ سے حسد کرے
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَوْتِ	اس سے مجھے میرا اللہ کافی، جو میرے ساتھ
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمَسْئَلَةِ فِي الْقَبْرِ	کوئی برا داؤں چلے مجھے اس سے میرا
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الْمِيْزَانِ،	اللہ کافی، موت کے وقت مجھے میرا
حَسْبِيَ اللّٰهُ عِنْدَ الصِّرَاطِ	اللہ کافی، قبر کے سوال کے وقت مجھے
حَسْبِيَ اللّٰهُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ	میرا اللہ کافی، وزن اعمال کے وقت

تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ

مجھے میرا اللہ کافی، صراط سے گذارنے کے وقت مجھے میرا اللہ کافی، بس مجھے میرا اللہ کافی ہے، اس کے سوا کوئی معبود و مولا نہیں، بس اسی پر میرا بھروسہ ہے اور وہ عرش عظیم کا رب ہے

(۳) اَللّٰهُمَّ لَكَ اَسْلَمْتُ وَبِكَ اٰمَنْتُ وَعَلَيْكَ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْكَ اَنَبْتُ وَبِكَ خَاصَمْتُ وَاِلَيْكَ حَاكَمْتُ فَاغْفِرْ لِيْ مَا قَدَّمْتُ وَمَا اَخَّرْتُ وَمَا اَسْرَرْتُ وَمَا اَعْلَنْتُ وَمَا اَسْرَفْتُ وَمَا اَنْتَ اَعْلَمُ بِهٖ مِنِّيْ اَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَاَنْتَ الْمُؤَخِّرُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ وَلَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

اے اللہ! میں نے اپنا سر اطاعت تیرے لئے جھکا دیا، میں تجھ پر ایمان لایا۔ میں نے تجھ پر توکل و اعتماد کر لیا۔ میں تیری طرف رجوع ہو گیا اور میں نے تجھے فیصلہ کن حکم مان لیا۔ سو تو میرے اگلے پچھلے اور چھپے کھلے سارے گناہ معاف کر دے اور جو میں نے زیادتیاں کیں ان کو دے اور اے اللہ میرے جن قصوروں سے تو مجھ سے زیادہ باخبر ہے، ان کو بھی معاف کر دے، تو ہی آگے اور پیچھے کرنے والا ہے، تیرے سوا کوئی معبود و مولا نہیں اور گناہوں سے بچنے اور نیکیاں کرنے کی طاقت بغیر اللہ کی مدد کے کسی کو نہیں۔

(۴) اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُكَ اِيْمَانًا دَائِمًا وَّاَسْئَلُكَ قَلْبًا خَاشِعًا وَّاَسْئَلُكَ يَقِيْنًا

اے اللہ! میں تجھ سے مانگتا ہوں ہمیشہ ساتھ رہنے والا ایمان اور تیرے ڈر سے سہا رہنے والا دل، اور میں تجھسے

صَادِقًا وَاَسْئَلُكَ دِيْنًا	مانگتا ہوں یقین صادق اور سچا دین اور
دِيْنًا قَيِّمًا وَاَسْئَلُكَ الْعَافِيَةَ	تجھ سے مانگتا ہوں ہر بلا سے عافیت اور
مِنْ كُلِّ بَلِيَّةٍ وَاَسْئَلُكَ دَوَامَ	دوامی عافیت اور پھر اس عافیت پر
الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الشُّكْرَ عَلَى	شکر گذاری کی توفیق اور اے اللہ میں تجھ
الْعَافِيَةِ وَاَسْئَلُكَ الْغِنٰى	سے سوال کرتا ہوں کہ سارے انسانوں سے
عَنِ النَّاسِ۔	تو مجھے بے نیاز رکھ۔

(۵) اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِكَ مِنْ اَنْ اَضِلَّ اَوْ اُضَلَّ اَوْ اَزِلَّ اَوْ اُزَلَّ اَوْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ اَوْ اَجْهَلَ اَوْ يُجْهَلَ عَلَيَّ

خداوندا! میں تیری پناہ چاہتا ہوں اس سے کہ خود گمراہ ہو جاوں یا کوئی دوسرا مجھے گمراہ کردے یا خود لغزش کھا جاوں یا کوئی دوسرا مجھے لغزش میں مبتلا کردے یا میں خود کسی پر ظلم کر بیٹھوں یا مجھ پر کوئی ظلم کرے یا میں نادانی کی کوئی حرکت کروں یا میرے ساتھ کوئی نادانی کی حرکت کر گزرے

(۶) اَللّٰهُمَّ اَصْلِحْ لِيْ دِيْنِيَ الَّذِيْ	اے اللہ میرے لئے میرا دین بنادے
هُوَ عِصْمَةُ اَمْرِيْ وَاَصْلِحْ	جو میرا آسرا ہے اور میرے لئے میری دنیا
لِيْ دُنْيَايَ الَّتِيْ فِيْهَا مَعَاشِيْ	بنادے جو میری زندگی ہے اور میرے
وَاَصْلِحْ لِيْ اٰخِرَتِيَ الَّتِيْ فِيْهَا	لئے میری آخرت بنادے جس میں مجھے
مَعَادِيْ وَاجْعَلِ الْحَيَاةَ	لوٹ کر جانا ہے اور زندگی کو میرے
زِيَادَةً لِّيْ فِيْ كُلِّ خَيْرٍ وَّاجْعَلِ	لئے ہر بھلائی میں ترقی کا ذریعہ بنا اور
الْمَوْتَ رَاحَةً لِّيْ مِنْ كُلِّ شَرٍّ	موت کو ہر برائی سے نجات کا سبب بنا

(۷) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ نَعِيْمًا لَّا يَنْفَدُ وَقُرَّةَ عَيْنٍ لَّا تَنْقَطِعُ وَأَسْئَلُكَ الرِّضَا بِالْقَضَاءِ وَبَرْدَ الْعَيْشِ بَعْدَ الْمَوْتِ۔

الٰہی میں تجھ سے ایسا لطف چاہتا ہوں جو ختم نہ ہو اور آنکھ کی ایسی ٹھنڈک جو زائل نہ ہو اور تجھ سے چاہتا ہوں تیرے فیصلہ پر تسلیم و رضا اور موت کے بعد پر لطف زندگی۔

(۸) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْعَفْوَ وَالْعَافِيَةَ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں بخشش اور سلامتی دنیا اور آخرت میں۔

(۹) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى

اے اللہ میں تجھ سے ہدایت، خدا ترسی پاکدامنی اور استغنا کا سوال کرتا ہوں۔

(۱۰) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ عِلْمًا نَافِعًا وَرِزْقًا طَيِّبًا وَعَمَلًا مُتَقَبَّلًا

اے اللہ! میں تجھ سے مفید علم، پاک روزی اور مقبول عمل کا سوال کرتا ہوں

(۱۱) اَللّٰهُمَّ اغْفِرْ لِيْ وَارْحَمْنِيْ وَعَافِنِيْ وَارْزُقْنِيْ۔

اے اللہ تو مجھے بخش دے مجھ پر رحم فرما، مجھے عافیت دے اور رزق عطا فرما۔

(۱۲) اَللّٰهُمَّ إِنِّيْ أَسْئَلُكَ عِيْشَةً نَقِيَّةً وَّمِيْتَةً سَوِيَّةً

اے اللہ! میں تجھ سے اچھی زندگی اور اچھی موت مانگتا ہوں۔

(۱۳) اَللّٰهُمَّ أَحْسِنْ عَاقِبَتَنَا فِي الْأُمُوْرِ كُلِّهَا وَأَجِرْنَا مِنْ خِزْيِ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ

اے اللہ ہمارا انجام اچھا کر کل کاموں میں اور ہم کو دنیا اور آخرت کی رسوائی سے بچا

(۱۴) اَللّٰهُمَّ اكْفِنِيْ بِحَلَالِكَ عَنْ حَرَامِكَ وَاَغْنِنِيْ بِفَضْلِكَ عَمَّنْ سِوَاكَ

اے اللہ! اپنی حلال کی ہوئی چیزوں سے میری کفایت کر کے مجھے حرام سے محفوظ رکھ اور اپنے خاص فضل کے ذریعہ سے مجھے سب ماسوا سے بے نیاز کر دے۔

(۱۵) اَللّٰهُمَّ افْتَحْ لَنَا اَبْوَابَ رَحْمَتِكَ وَسَهِّلْ لَنَا اَبْوَابَ رِزْقِكَ

اے اللہ ہمارے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول دے اور اپنے رزق کے راستے ہمارے لئے آسان کر دے

(۱۶) اَللّٰهُمَّ الْطُفْ بِيْ فِيْ تَيْسِيْرِ كُلِّ عَسِيْرٍ فَاِنَّ تَيْسِيْرَ كُلِّ عَسِيْرٍ عَلَيْكَ يَسِيْرٌ وَّاَسْئَلُكَ الْيُسْرَ وَالْمُعَافَاةَ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ اَللّٰهُمَّ اعْفُ عَنِّيْ فَاِنَّكَ عَفُوٌّ كَرِيْمٌ۔

اے اللہ! ہر مشکل کو آسان کر کے مجھ پر مہربانی فرما۔ سب مشکلوں کا آسان کرنا تیرے لئے بالکل آسان ہے اور اے اللہ دنیا اور آخرت میں عافیت عطا ہونے کی تجھ سے التجا ہے۔ خداوندا مجھے معاف فرما دے۔ تو بہت معاف کرنے والا بڑا کریم ہے۔

(۱۷) يَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِيْ عَلٰى دِيْنِكَ

اے دلوں کے پھیرنے والے میرے دل کو اپنے دین پر مضبوطی سے قائم کر اور قائم رکھ

(۱۸) اَللّٰهُمَّ اِنَّ قُلُوْبَنَا وَنَوَاصِيَنَا وَجَوَارِحَنَا بِيَدِكَ لَمْ تُمَلِّكْنَا مِنْهَا شَيْئًا فَاِذَا فَعَلْتَ ذٰلِكَ

اے اللہ ہمارے دل اور ہماری پیشانیاں اور ہمارے سب اعضاء تیرے ہاتھ میں ہیں۔ ہم کو ان پر کچھ اختیار نہیں ہے

فَكُنْ اَنْتَ وَلِيَّنَا وَاهْدِنَا اِلٰى سَوَآءِ السَّبِيْلِ۔

پس جبکہ تو نے یہ کیا ہے تو پھر تو ہی خود ہمارا کارساز و مددگار ہو جا اور ہم کو ٹھیک راستہ پر چلا۔

(۱۹) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِىْ اَخْشَاكَ كَاَنِّىْ اَرَاكَ اَبَدًا حَتّٰى اَلْقَاكَ وَاَسْعِدْنِىْ بِتَقْوَاكَ وَلَا تُشْقِنِىْ بِمَعْصِيَتِكَ

اے اللہ مجھے ایسا کر دے کہ میں تیرے حضور میں پیش ہونے تک تجھ سے ایسا ڈروں کہ گویا ہر وقت تجھے دیکھتا ہوں اور اپنا خوف و تقویٰ عطا فرما کر مجھے نیک نصیب کر اور اپنی معصیتوں میں مبتلا کر کے میری بدنصیبی کا فیصلہ نہ فرما۔

(۲۰) اَسْئَلُكَ خَشْيَتَكَ فِى الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ وَكَلِمَةَ الْاِخْلَاصِ فِى الرِّضَا وَالْغَضَبِ۔

تجھ سے تیرا ڈر مانگتا ہوں حاضر میں اور غائب میں اور سچائی کی بات خوشی میں اور غصہ میں

(۲۱) اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِىْ عَيْنَيْنِ هَطَّالَتَيْنِ تَسْقِيَانِ الْقَلْبَ بِذُرُوْفِ الدَّمْعِ مِنْ خَشْيَتِكَ قَبْلَ اَنْ تَكُوْنَ الدُّمُوْعُ دَمًا وَالْاَضْرَاسُ جَمْرًا

اے اللہ مجھے ایسی اشکبار آنکھیں عطا فرما جو تیرے خوف کے آنسو بہا کے دل کو سیراب کریں، اس سخت وقت کے آنے کے پہلے جبکہ آنسو خون ہو جائینگے اور داڑھیں انگارہ بن جائینگی۔

(۲۲) اَللّٰهُمَّ اٰتِ نَفْسِىْ تَقْوٰهَا وَزَكِّهَا اَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكّٰهَا اَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا۔

اے اللہ میرے نفس کو پرہیزگاری عطا فرما اور اسکو پاک کر دے۔ تو ہی سب سے بہتر اسکا پاک کرنے والا ہے تو ہی اس کا مالک اور آقا ہے

(۲۳) اَللّٰهُمَّ حَبِّبْ اِلَيْنَا الْاِيْمَانَ

اے اللہ ایمان کو ہمارے لئے پیارا اور

وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِنَا وَكَرِّهْ إِلَيْنَا الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ وَاجْعَلْنَا مِنَ الرَّاشِدِينَ اللّٰهُمَّ تَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ وَأَلْحِقْنَا بِالصَّالِحِينَ غَيْرَ خَزَايَا وَلَا مَفْتُونِينَ۔

محبوب بنا اور ہمارے دلوں میں اس کو آراستہ فرما اور کفر و فسق اور معصیت کی طرف سے ہمارے اندر نفرت و کراہت پیدا کر دے، ہم کو رشد و ہدایت والوں میں سے کر دے۔ اے اللہ اسلام پر خاتمہ کر اور ہم کو اپنے صالح بندوں کے ساتھ ملا دے۔ نہ ہم رسوا ہوں نہ فتنوں میں پڑیں۔

(۲۴) اللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ حُبَّكَ وَحُبَّ مَنْ يُحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ يُقَرِّبُ إِلَى حُبِّكَ۔

اے میرے اللہ مجھے اپنی محبت دے تیرے جو بندے تجھ سے محبت رکھتے ہوں ان کی محبت دے اور جو اعمال تیری محبت سے مجھے قریب کریں، ان کی محبت دے

(۲۵) اللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ

اے اللہ اپنے ذکر و شکر اور اچھی عبادت پر میری مدد فرما اور مجھے اپنا ذاکر و شاکر اور اچھا عبادت گذار بندہ بنا دے۔

(۲۶) اللّٰهُمَّ فَالِقَ الْإِصْبَاحِ وَجَاعِلَ اللَّيْلِ سَكَنًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا قَوِّنِي عَلَى الْجِهَادِ فِي سَبِيلِكَ۔

اے اندھیری رات کا پردہ چاک کر کے صبح کے روشن کرنے والے مولا اور رات کو سکون و آرام کا ذریعہ بنانے والے آقا! چاند سورج کو اوقات شناسی کا آلہ مقرر کرنے والے میرے اللہ! مجھے اپنی راہ میں پوری جد و جہد کرنے کی قوت عطا فرما

(۲۷) اَللّٰهُمَّ وَفِّقْنِیْ لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی مِنَ الْقَوْلِ وَالْعَمَلِ وَالْفِعْلِ وَالنِّیَّةِ وَالْهُدٰی اِنَّكَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ۔

اے اللہ! جو باتیں اور جو اعمال و افعال اور جو ارادے اور جو طریقے تجھے پسند اور محبوب ہوں اور تو جن سے راضی ہو انہی کی مجھے توفیق دے۔ مولا سب کچھ تیرے قبضۂ قدرت میں ہے۔

(۲۸) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ سَرِیْرَتِیْ خَیْرًا مِنْ عَلَانِیَتِیْ وَاجْعَلْ عَلَانِیَتِیْ صَالِحَةً

اے اللہ! میرا باطن میرے ظاہر سے اچھا کر دے اور میرے ظاہر کو بھی صلاحیت عطا فرما۔

(۲۹) اَللّٰهُمَّ اَلْهِمْنِیْ رُشْدِیْ وَقِنِیْ شَرَّ نَفْسِیْ۔

اے اللہ! بھلائی اور سچائی کی باتیں میرے دل میں ڈال اور اپنے نفس کی شرارتوں سے مجھے محفوظ رکھ۔

(۳۰) اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ مِنَ الَّذِیْنَ اِذَا اَحْسَنُوْا اسْتَبْشَرُوْا وَاِذَا اَسَاءُوْا اسْتَغْفَرُوْا۔

خداوندا! مجھے اپنے ان بندوں میں سے کر دے جو نیکی کرتے ہیں تو خوش ہوتے ہیں اور اگر ان سے کوئی برائی ہو جاتی ہے تو توبہ و استغفار کر کے اس کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں۔

(۳۱) اَللّٰهُمَّ غَشِّنِیْ بِرَحْمَتِكَ وَجَنِّبْنِیْ عَذَابَكَ

اے اللہ! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانک لے اور اپنے عذاب سے بچا دے

(۳۲) اَللّٰهُمَّ ثَبِّتْ قَدَمِیْ یَوْمَ تَزِلُّ فِیْهِ الْاَقْدَامُ۔

اے اللہ جس دن لوگوں کے قدم ڈگمگانے لگیں اس دن تو مجھے ثابت قدم رکھ

(۳۳) اَللّٰھُمَّ حَاسِبْنِیْ حِسَابًا یَسِیْرًا۔

اے اللہ قیامت کے دن میرا حساب آسانی سے ہو۔

(۳۴) اَللّٰھُمَّ اَحْسَنْتَ خَلْقِی فَاَحْسِنْ خُلُقِی

اے اللہ تو نے میری صورت اچھی بنائی تو میرے اخلاق بھی اچھے کر

(۳۵) اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ صِحَّۃً فِی اِیمَانٍ وَاِیمَانًا فِی حُسْنِ خُلُقٍ

اے اللہ میں تجھ سے تندرستی ایمان کے ساتھ اور ایمان حسن اخلاق کیساتھ مانگتا ہوں

(۳۶) اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوذُبِکَ مِنَ الشِّقَاقِ وَالنِّفَاقِ وَسُوْءِ الاَخلَاقِ۔

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں جھگڑے سے، دورخی سے اور بدخُلقی سے

(۳۷) اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَالْکُفْرِ وَالْفُسُوْقِ وَالشِّقَاقِ وَالسُّمْعَۃِ وَالرِّیَاءِ۔

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں عاجزی سستی اور بخل سے اور کفر سے گناہ سے جھگڑے سے اور شہرت کی خواہش اور دکھاوے سے۔

(۳۸) اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْفَقْرِ وَالْفَاقَۃِ وَالذِّلَّۃِ وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ اَنْ اَظْلِمَ اَوْ اُظْلَمَ

اے اللہ میں تیری پناہ مانگتا ہوں محتاجی سے، فاقہ سے اور ذلت سے اور اس سے کہ میں ظلم کروں یا مجھ پر ظلم کیا جائے۔

(۳۹) اَللّٰھُمَّ ضَعْ فِی اَرْضِنَا بَرَکَتَھَا وَزِیْنَتَھَا وَسَکَنَھَا۔

اے اللہ ہماری زمین میں اس کی برکت زینت اور آبادی رکھ۔

(۴۰) اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ اَوْسَعَ رِزْقِکَ عَلَیَّ عِنْدَ کِبَرِ سِنِّی وَانْقِطَاعِ عُمْرِی۔

اے اللہ میرے رزق میں سب سے زیادہ کشادگی میرے بڑھاپے اور میرے خاتمہ کے وقت پر کر۔

اللّٰهُمَّ اجْعَلْ صَلَوَاتِكَ وَبَرَكَاتِكَ وَرَحْمَتَكَ عَلٰى سَيِّدِ الْمُرْسَلِيْنَ
وَاِمَامِ الْمُتَّقِيْنَ وَخَاتَمِ النَّبِيِّيْنَ مُحَمَّدٍ عَبْدِكَ وَرَسُوْلِكَ اِمَامِ الْخَيْرِ
وَقَائِدِ الْخَيْرِ وَرَسُوْلِ الرَّحْمَةِ اللّٰهُمَّ ابْعَثْهُ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا يَّغْبِطُهٗ
فِيْهِ الْاَوَّلُوْنَ وَالْاٰخِرُوْنَ۔ اللّٰهُمَّ اَبْلِغْهُ الْوَسِيْلَةَ وَالدَّرَجَةَ الرَّفِيْعَةَ
مِنَ الْجَنَّةِ۔ اللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِي الْمُصْطَفَيْنَ مَحَبَّتَهٗ وَفِي الْمُقَرَّبِيْنَ مَوَدَّتَهٗ
وَفِي الْاَعْلَيْنَ ذِكْرَهٗ وَالسَّلَامُ عَلَيْهِ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ
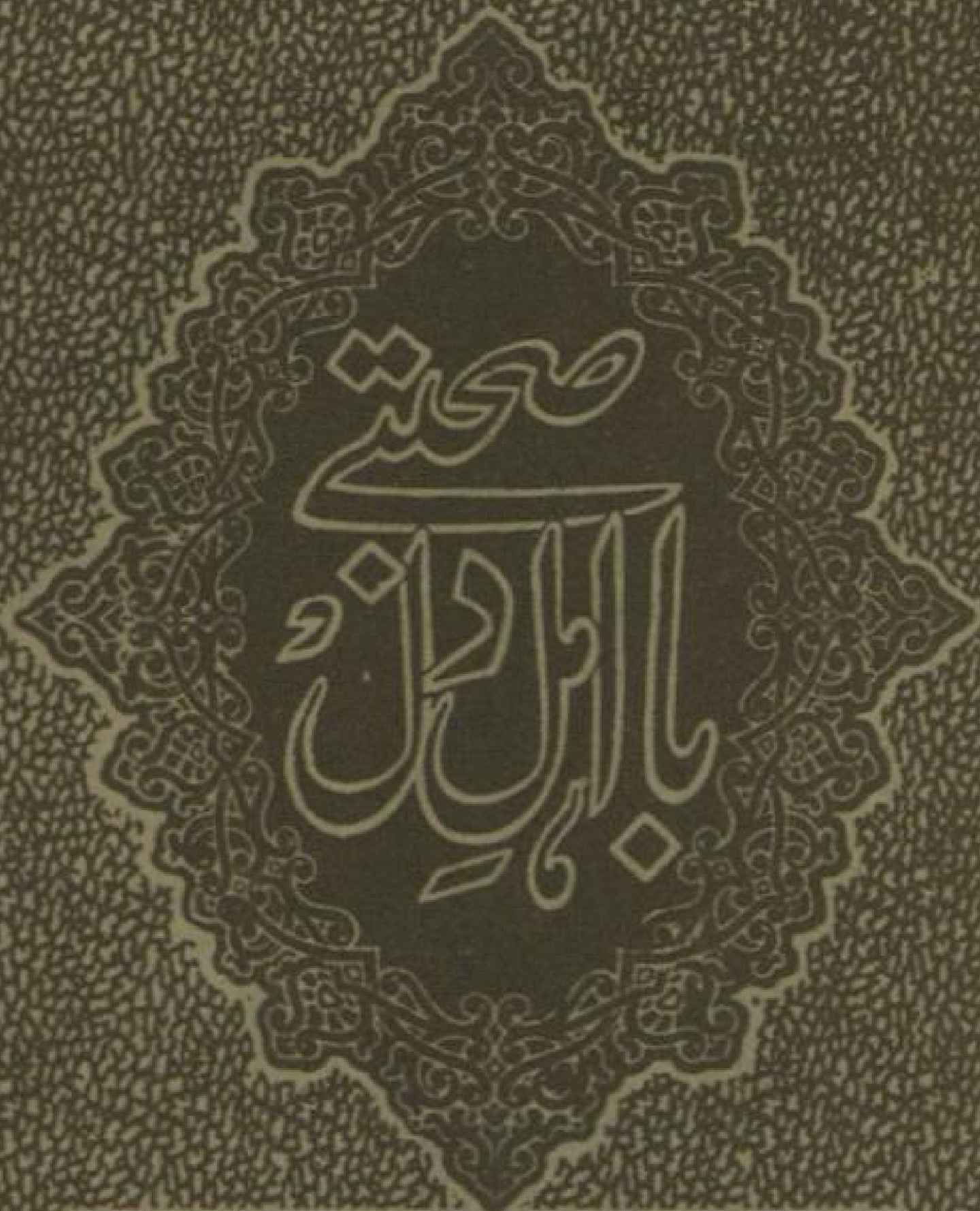
صحبتے با اہلِ دل
حضرت شاہ محمد یعقوب صاحب مجددیؒ بھوپالی کے وہ مجلسی ارشادات و
ملفوظات جن میں عصر حاضر کے ذوق و مزاج کے مطابق زندگیوں کی اصلاح
کا پیغام اور ایمان و یقین پیدا کرنے کا وافر سامان موجود ہے ——
مولانا سید ابوالحسن علی ندوی
مجلس نشریات اسلام
۱۔ کے ۔ ۳۔ ناظم آباد ۔ کراچی ۱۸

مغربی زندگی کے اُس طوفان کی
تصویر جس سے گذر کر محمد اسد قلبی اور
روحانی سکون کے ساحل تک پہنچے
اور ایمان سے بہرہ یاب ہوگئے

از

محمد اسد (سابق لیوپولڈ وِیس)

پیش لفظ

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

ترجمہ: محمد الحسنی ندوی
مدیر "البعث الاسلامی"

مجلس نشریات اسلام ۱-کے-۳-ناظم آباد ۱ کراچی ۱۸